ریزہ ریزہ حیات

(افسانوی مجموعہ)



دیپک بُدکی

میزان پبلیکیشنز
سرینگر کشمیر

دیپک بُدکی





ریزہ ریزہ حیات

(افسانوں کا مجموعہ)

مصنف کی دیگر تصانیف

اُردو:

- ادھورے چہرے (افسانوی مجموعہ)
- چنار کے پنجے (افسانوی مجموعہ)
- زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (افسانوی مجموعہ)
- عصری تحریریں (تنقیدی مضامین وتبصرے)
- عصری شعور (تنقیدی مضامین وتبصرے)
- عصری تقاضے (تنقیدی مضامین وتبصرے)

ہندی:

- ادھورے چہرے (کہانی سنگرہ)
- چنار کے پنجے (کہانی سنگرہ)

مصنف پر لکھی گئی کتابیں

- ورق ورق آئینہ ____ دیپک بُدکی، شخصیت وفن
(پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری)
- دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری
(جاوید اقبال شاہ، ایم فل، جموں یونیورسٹی)

ریزہ ریزہ حیات

(افسانوں کا مجموعہ)

دیپک بُدکی

میزان پبلشرز (رجسٹرڈ)

متصل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس

بٹہ مالو۔ سرینگر کشمیر۔۱۹۰۰۰۱

ISBN

نام کتاب : ریزہ ریزہ حیات (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : دیپک بُدکی

سن اشاعت : پہلا ایڈیشن جنوری ۲۰۱۱ء

قیمت : اندرون ملک۔ دوسو روپے (Rs.200/-)

بیرون ملک۔ دس ڈالر (\$10/-)

کمپیوٹر کمپوزنگ : مسعود احمد، جموں

مطبع : میزان پرنٹرس، سرینگر

ناشر : میزان پبلشرز، بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس،

بٹہ مالو، سرینگر۔ کشمیر۔ ۱۹۰۰۰۱

REZA REZA HAYAT

(Collection of Short Stories)

Author : **Deepak Budki**

Price : India : Two Hundred Rupees (Rs.200/-)

Foreign : Ten Dollars (\$10/-)

Publisher : **Meezan Publishers**

Opp. Fire & Emergency Services Hedquarters

Batamaloo, Srinagar, Kashmir-190001

Tel: Off. 0194: 2470851 Fax: 2457215

Mobile: 9419002212

email: meezanpublishers@ rediffmail.com

انتساب

اپنے پیارے بھائی

اشوک دلال (گگو)

کے

نام

سپاس نامہ

اس مجموعے میں شامل سبھی افسانے برصغیر ہندوپاک کے معروف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں ان تمام مدیروں کا شکرگزار ہوں جنہوں نے ان افسانوں کو اپنے گرانقدر رسالوں میں شائع کیا۔ چند قارئین نے ان افسانوں پر اپنے تاثرات بھی بھیج دیے جن سے نہ صرف میری حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ کہیں کہیں اپنی خامیوں کا احساس بھی ہوا۔ ان قارئین کے تئیں اظہار تشکر کرنا ضروری ہے۔

ادبی سفر میں چند ایک دوست ایسے ملے جنہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ نام ہیں: نورشاہ، شہاب ملک، فرید پربتی، انور ظہیر انصاری، پریمی رومانی، ف س اعجاز، ظفر اقبال ظفؔر، انیس رفیع، سیفی سرونجی، نذیر فتح پوری، سیدہ نسرین نقاش اور شبنم عشائی۔ سرحد کے اُس پار بھی مخلص لوگوں کی کمی نہیں پائی۔ اظہر جاوید، انور سدید، گلزار جاوید، سلطانہ مہر، صدیقہ بیگم، فرخ صابری، آغا گل اور طفیل اختر کے نام بطور خاص تحریر کر رہا ہوں۔ ان سب کرم فرماؤں کا شکریہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

آخر میں اس مجموعے کے ناشر شبیر احمد اور کمپیوٹر کمپوزر مسعود احمد کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی محبتیں ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہیں۔

دیپک بُدکی

وسندھرا، غازی آباد۔۲۰۱۰۱۲

۲؍جنوری ۲۰۱۱ء

تحریر ظہری

اس افسانوی مجموعے میں شامل سبھی افسانے تخیل
کی پیداوار ھیں- ان میں منعکس واقعات، حادثات اور
کردار سبھی فرضی ھیں- کسی واقعے، حادثے یا کردار
کے ساتھ کوئی بھی مشابہت محض اتفاق ھو سکتی ھے
جس کے لیے مصنف یا ناشر ذمے وار نہیں ھو گا-

فہرست

حرفِ اوّل

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں کہانیاں کیوں لکھتا ہوں؟ کیا فرق پڑتا ہے ان کہانیوں سے؟ پریم چند نے اپنی پوری زندگی سماج سدھار کے لیے وقف کی تھی۔ بال ودِواہ، بیواؤں کی از سرِ نو شادی، مہاجنی تہذیب، توہم پرستی، طبقاتی اونچ نیچ اور مذہبی تعصب کے خلاف اس نے عمر بھر اپنا قلم اٹھایا مگر آج ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں یہ بدعتیں ترویج پا رہی ہیں اور ہمارے رہنما مصلحتاً ان کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مذہبی کٹر پرستی تقلیبِ ماہیت کر کے دہشت گردی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آدمی کو صبح گھر سے نکلتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شام کو واپس آئے گا بھی یا نہیں۔ آئے دن ذرائع ابلاغ میں رشوت خوری، اغوا، زنا بالجبر، تزویجِ محرمات، سادھو سنتوں کے ہاتھوں ضعیف الاعتقادوں کا استحصال اور اشیائے خوردنی میں زہریلی ملاوٹوں کی خبریں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ دولت مند اور اثر ورسوخ والے لوگ جرم کر کے بھی بچ نکلتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹیلی ویژن چینل ایسی خبروں کو صبح وشام توڑ مروڑ کر اور سنسنی خیز بنا کر معاشرے کی اصلاح کی خاطر کم اور اپنی مقبولیت بڑھانے کے لیے زیادہ پیش کرتے رہتے ہیں۔

سنا ہے انگریزوں نے چینیوں کو ناکارہ محتاج بنانے کے لیے افیم کی عادت ڈال دی تھی۔ آج افیم پلانے کی کئی اور صورتیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ کروڑوں غریب لوگ اپنے خون پسینے کی کمائی کرکٹ

میچوں کی ٹکٹیں خریدنے یا پھر رئیلٹی شوز کو ایس ایم ایس بھیجنے پر صرف کرتے ہیں۔ان کی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں جبکہ کرکٹ کھلاڑیوں اور رئیلٹی شوز کے منتظمین کی تجوریاں کروڑوں روپے سے بھر جاتی ہیں۔غریب کسان بھوکمری اور قرضے کی تاب نہ لاکر خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جبکہ سرمایہ داروں کے لیے ہر سال بجٹ میں رعایتوں پر رعایتیں دی جاتی ہیں۔ جب میں ان باتوں پر سوچ بچار کرتا ہوں تو دل میں طوفان سا اٹھتا ہے اور قلم خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے۔چونتیس سال گورنمنٹ نوکری کرنے کے باوجود میں نے ہمیشہ نڈر ہو کر نازک اور زود حس موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور بے باکانہ طور پر اپنے محسوسات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔

معاصر مسائل کے علاوہ میں نے انسانی نفسیات پر بھی افسانے قلمبند کیے ہیں۔ انسانی سرشت پرت در پرت اپنے اندر غلاظت چھپائے بیٹھی رہتی ہے۔ بدطینت لوگ اپنے چہروں پر مسکراہٹ اوڑھے ہر طرف نظر آتے ہیں۔ہم ان کی مقناطیسی شخصیت سے مرعوب ہو کر اپنی زندگی کا سودا کرتے ہیں۔وہ چاہے ووٹ کے ذریعے ہو،اندھی پیروی کے توسط سے ہو یا پھر طاقت کے بل بوتے پر ہو۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں کہانی نہیں لکھتا بلکہ کہانی مجھے لکھتی ہے کیونکہ مجھے پورا احساس ہے کہ قلم اٹھانے سے پہلے میرے ذہن کے پردے پر پلاٹ کی روپ ریکھا اور کرداروں کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔میرا ذہن کہانی کو جس سمت لے جانا چاہتا ہے،موڑ لیتا ہے۔میری یہ شعوری کوشش رہتی ہے کہ کہانی نہ صرف پُر تاثیر ہو بلکہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو۔اس لیے مجھے یہ لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ اپنی کہانیاں میں خود لکھتا ہوں اور ان میں کسی اور کا دخل نہیں ہوتا۔

اس مجموعے میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ چند ایک افسانوں کے پلاٹ میرے ذہن میں کئی دہائیوں سے کلبلا رہے تھے جبکہ بیشتر کہانیاں ہم عصر موضوعات پر رقم کی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین ان کہانیوں کو پسند فرمائیں گے اور اپنے تاثرات سے ضرور نوازیں گے۔

وسُندھرا، غازی آباد (یوپی)۔۲۰۱۰۱۲ دیپک بُدکی

۲رجنوری ۲۰۱۱ء

ڈاکٹر آنٹی

ڈاکٹر آنٹی سے میری ملاقات اتفاق سے ہوئی تھی۔ میرے ایک دوست کی بہن لِلتابی ایڈ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سرینگر آئی تھی۔ کملا دیوی اور اس کی بیٹی چھ سات روز کے لیے گرمیوں میں لِلتا کے گھر میں وارد ہوئیں۔ آنٹی سیدھی سادی، درمیانہ قد کی، معمولی سوتی ساڑی میں ملبوس خلوص اور دردمندی کا پیکر لگ رہی تھی۔ اُس کو دیکھ کر کسی کو یہ گماں بھی نہ گزرتا کہ وہ نسائی امراض کی مشہور اور کامیاب ڈاکٹر ہے۔

میں پہلی ہی ملاقات میں اس کی شخصیت سے مرعوب ہو گیا اور اس میں اپنی کھوئی ہوئی ماں ڈھونڈ نے لگا۔ یہی قلبی تعلق میرے اور اس کی بیٹی کے درمیان قربت کا موجب بن گیا۔ میں نے اپنا سارا کام کاج چھوڑ کر ایک ماہر گائیڈ کی مانند انہیں دلچسپ مقامات کی سیر کروائی، دستکاریوں کی چھوٹی موٹی چیزیں دلوائیں، اور پھر چار روز کے بعد اشک آلود آنکھوں کے ساتھ رخصت کرنے کے لیے ان کے گھر پہنچ گیا۔

مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر کملا دیوی نے یوں اظہارِ تشکر کیا۔

''بیٹے، تم نے تو ہمیں اتنا ممنون کر دیا کہ شکریہ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔''

''آنٹی، آپ تو میری ماں سمان ہیں۔ اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔'' میں نے بڑی حلیمی سے جواب دیا۔

اس کی بیٹی سریتا کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ شاید کہہ رہی تھی ''کس بات کا شکریہ ممی، یہ تو تمہاری بیٹی کو ہی لوٹ کر لے گیا۔ تھوڑی بہت سیر کروالی تو کون سا بڑا کام کیا۔''

میں نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تاہم کبھی کبھار اس کو دیکھ لیتا اور مسکرا دیتا جس کا جواب وہ بھی خندہ لبی سے دے دیتی۔

اتنے میں لِلِتا چائے اور ناشتہ لے کر آئی اور ہمارے پاس ہی بیٹھ گئی۔ آنٹی مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوئی۔

''بیٹے کل صبح ہم یہاں سے کٹڑہ جا رہے ہیں۔ ماتا ویشنو دیوی کے درشن کرنے۔ تم کبھی ویشنو دیوی گئے ہو کیا؟''

''نہیں آنٹی، میں تو صرف دو بار وادی کے باہر گیا۔ ایک بار جموں گیا تھا۔ تب میری عمر سات سال کی تھی اور دوسری بار اوٹا کمنڈ ایجوکیشنل ٹور پر گیا تھا۔ اس وقت میں یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا۔''

''پھر تم بھی ہمارے ساتھ ماتا کے درشن کرنے کے لیے چلو۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ناستک ہونے کے سبب مجھے مندروں وندروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ دو چار روز کے مزید ساتھ نے مجھے للچا دیا اور میں نے بنا سوچے سمجھے حامی بھر لی۔

ادھر میرے ہی شہر میں آنٹی نے مجھے بہت مشکور کیا تھا۔ بن بلائے ہی میرے غریب خانے پر تشریف لے آئی۔ پورے خاندان کے ساتھ ایسے گھل مل گئی کہ ہر کوئی اُس کے گن گانے لگا۔ گھر میں علیل پھوپھی پر نظر پڑی تو اس کی پوری طرح جانچ کر لی اور اس کو چند ضروری ہدایات اور دوائیاں لکھ کر دیں۔

دوسرے روز کندھے پر ائیر بیگ لٹکائے میں ان کے ہمراہ کٹڑہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس سفر کے دوران میں اس کنبے کا ایک فرد سا بن گیا۔

جب لوٹ کر آیا آنٹی میرے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی۔ حالاں کہ اس کی بیٹی کے ساتھ میرا معاشقہ شروع ہوا تھا اور خط و کتابت بھی ہونے لگی تھی۔ اس کے باوجود میرے خیالوں میں آنٹی پہلے آ جاتی اور اس کی بیٹی بعد میں۔ کچھ عرصے کے بعد میں اپنے اور سریتا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ چونکہ موجودہ حالات میں مجھے اپنا آپ ڈاکٹر سریتا کے قابل نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے نوکری سے استعفیٰ دے کر ملازمت کی تلاش میں دہلی پہنچ گیا۔ دہلی میں پاؤں رکھنے کے دوسرے روز ہی میں نے آنٹی کی رہائش پر حاضری دی۔ رہائش کیا تھی، موتی نگر میں لبِ سڑک ایک کلینک تھا جس میں وہ پریکٹس کرتی تھی۔ اس کے پچھواڑے میں ایک مکان ملحق تھا جہاں پر وہ اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کے ساتھ

رہتی تھی ۔ تینوں بھائی بہن کنوارے تھے ۔ سریتا دراصل آنٹی کے ایک اور بھائی کی لڑکی تھی جس کو اُس نے گود لیا تھا۔

ڈھونڈتا ڈھانڈتا میں کلینک کے سامنے پہنچ گیا۔ دکان پر ایک تختی لٹک رہی تھی۔ 'ڈاکٹر کملا دیوی' گائنوکولجسٹ ۔ میں نے رسماً دروازے پر دستک دی اور جواب ملتے ہی اندر داخل ہوا۔ کملا آنٹی کسی مریض کا نبض دیکھ رہی تھی ۔ میری طرف دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''بیٹے، تم کب آئے؟''

''کل ہی آیا ہوں۔ دراصل وہ نوکری مجھے پسند نہیں تھی اس لیے چھوڑ دی ۔ اب یہاں دہلی میں ہی نوکری ڈھونڈ لوں گا۔''

''تم اندر جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں پانچ دس منٹ میں آجاؤں گی۔''

میں ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ سامنے بیڈروم سے سریتا نکل آئی اور میرے مقابل بیٹھ کر میرا حال چال پوچھنے لگی۔ اس نے مجھے چھوٹی آنٹی اور انکل کا تعارف بھی کرایا۔

''سریندر، یہ ممی کی چھوٹی بہن ہے۔ شاردا آنٹی دانتوں کی ڈاکٹر ہے۔ اور یہ ہیں ممی کے چھوٹے بھائی امرناتھ انکل۔''

میں نے دونوں کو نمستے کہہ کر مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آنٹی کلینک سے کب اندر آئی اور اس نے ہمارے لیے کب چائے اور ناشتہ بنالیا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ پھر وہ شفقت بھرے لہجے میں سے بولی۔

''تم نے، بیٹے، نوکری کیوں چھوڑی دی؟ پہلے چھٹی لے کر یہاں نوکری ڈھونڈ لیتے ، جب نئی نوکری مل جاتی تب پرانی چھوڑ دیتے۔''

''نہیں آنٹی، وہاں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ مکاری، لوٹ کھسوٹ اور رشوت خوری کے سوا اس نوکری میں رکھا ہی کیا تھا۔''

''خیر بھگوان جو کرتا ہے، اچھا ہی کرتا ہے۔ شاید اسی میں تمہاری بھلائی ہو۔'' کچھ وقفے کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ ''دہلی میں رہنے کا کیا انتظام ہے؟''

''رہنے کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ایک دوست کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتا ہوں۔''

دہلی کے قیام کے دوران سریتا اور میں اکثر ملتے رہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کملا دیوی کی

اس کی بیٹی سریتا کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ شاید کہہ رہی تھی ''کس بات کا شکریہ ممی، یہ تو تمہاری بیٹی کو ہی لوٹ کر لے گیا۔ تھوڑی بہت سیر کروالی تو کون سا بڑا کام کیا۔''

میں نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تاہم کبھی کبھار اس کو دیکھ لیتا اور مسکرا دیتا جس کا جواب وہ بھی خندہ لبی سے دے دیتی۔

اتنے میں للِتا چائے اور ناشتہ لے کر آئی اور ہمارے پاس ہی بیٹھ گئی۔ آنٹی مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوئی۔

''بیٹے کل صبح ہم یہاں سے کٹرہ جا رہے ہیں۔ ماتا ویشنو دیوی کے درشن کرنے۔ تم کبھی ویشنو دیوی گئے ہو کیا؟''

''نہیں آنٹی، میں تو صرف دوبار وادی کے باہر گیا۔ ایک بار جموں گیا تھا۔ تب میری عمر سات سال کی تھی اور دوسری بار اوٹا کمنڈ ایجوکیشنل ٹور پر گیا تھا۔ اس وقت میں یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔''

''پھر تم بھی ہمارے ساتھ ماتا کے درشن کرنے کے لیے چلو۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ناستک ہونے کے سبب مجھے مندروں وندروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ دو چار روز کے مزید ساتھ نے مجھے للچا دیا اور میں نے بنا سوچے سمجھے حامی بھر لی۔

ادھر میرے ہی شہر میں آنٹی نے مجھے بہت مشکور کیا تھا۔ بن بلائے ہی میرے غریب خانے پر تشریف لے آئی۔ پورے خاندان کے ساتھ ایسے گھل مل گئی کہ ہر کوئی اُس کے گن گانے لگا۔ گھر میں علیل پھوپھی پر نظر پڑی تو اس کی پوری طرح جانچ کر لی اور اس کو چند ضروری ہدایات اور دوائیاں لکھ کر دیں۔

دوسرے روز کندھے پر ائیر بیگ لٹکائے میں ان کے ہمراہ کٹرہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس سفر کے دوران میں اس کنبے کا ایک فرد سا بن گیا۔

جب لوٹ کر آیا آنٹی میرے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی۔ حالاں کہ اس کی بیٹی کے ساتھ میرا معاشقہ شروع ہوا تھا اور خط و کتابت بھی ہونے لگی تھی۔ اس کے باوجود میرے خیالوں میں آنٹی پہلے آ جاتی اور اس کی بیٹی بعد میں۔ کچھ عرصے کے بعد میں اپنے اور سریتا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ چونکہ موجودہ حالات میں مجھے اپنا آپ ڈاکٹر سریتا کے قابل نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے نوکری سے استعفیٰ دے کر ملازمت کی تلاش میں دہلی پہنچ گیا۔ دہلی میں پاؤں رکھنے کے دوسرے روز ہی میں نے آنٹی کی رہائش پر حاضری دی۔ رہائش کیا تھی، موتی نگر میں لبِ سڑک ایک کلینک تھا جس میں وہ پریکٹس کرتی تھی۔ اس کے پچھواڑے میں ایک مکان ملحق تھا جہاں پر وہ اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کے ساتھ

رہتی تھی ۔ تینوں بھائی بہن کنوارے تھے ۔ سریتا دراصل آنٹی کے ایک اور بھائی کی لڑکی تھی جس کو اُس نے گود لیا تھا۔

ڈھونڈتا ڈھانڈتا میں کلینک کے سامنے پہنچ گیا ۔ دکان پر ایک تختی لٹک رہی تھی ۔'ڈاکٹر کملا دیوی' گائنوکولجسٹ ۔ میں نے رسماً دروازے پر دستک دی اور جواب ملتے ہی اندر داخل ہوا۔ کملا آنٹی کسی مریض کا نبض دیکھ رہی تھی ۔ میری طرف دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ۔

''بیٹے، تم کب آئے؟''

''کل ہی آیا ہوں ۔ دراصل وہ نوکری مجھے پسند نہیں تھی اس لیے چھوڑ دی ۔ اب یہاں دہلی میں ہی نوکری ڈھونڈ لوں گا۔''

''تم اندر جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں پانچ دس منٹ میں آجاؤں گی۔''

میں ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ سامنے بیڈروم سے سریتا نکل آئی اور میرے مقابل بیٹھ کر میرا حال چال پوچھنے لگی۔ اس نے مجھے چھوٹی آنٹی اور انکل کا تعارف بھی کرایا۔

''سریندر، یہ ممی کی چھوٹی بہن ہے۔ شاردا آنٹی دانتوں کی ڈاکٹر ہے۔ اور یہ ہیں ممی کے چھوٹے بھائی امرناتھ انکل۔''

میں نے دونوں کو نمستے کہہ کر مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آنٹی کلینک سے کب اندر آئی اور اس نے ہمارے لیے کب چائے اور ناشتہ بنالیا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ پھر وہ شفقت بھرے لہجے میں سے بولی۔

''تم نے، بیٹے، نوکری کیوں چھوڑی دی؟ پہلے چھٹی لے کر یہاں نوکری ڈھونڈ لیتے، جب نئی نوکری مل جاتی تب پرانی چھوڑ دیتے۔''

''نہیں آنٹی، وہاں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ مکاری، لوٹ کھسوٹ اور رشوت خوری کے سوا اس نوکری میں رکھا ہی کیا تھا۔''

''خیر بھگوان جو کرتا ہے، اچھا ہی کرتا ہے۔ شاید اسی میں تمہاری بھلائی ہو۔'' کچھ وقفے کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ ''دہلی میں رہنے کا کیا انتظام ہے؟''

''رہنے کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ایک دوست کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتا ہوں۔''

دہلی کے قیام کے دوران سریتا اور میں اکثر ملتے رہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کملا دیوی کی

اصلی بیٹی نہیں ہے بلکہ اس کے بڑے بھائی کی بیٹی ہے جو کوئمبٹور میں سوتی کپڑوں کے کارخانے کا مالک ہے۔ کملا دیوی نے سریتا کو بچپن ہی میں گود لیا تھا اور اس کو خونِ جگر سے پالا تھا۔ بٹوارے کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد کملا دیوی، امرناتھ اور چھوٹی بہن شاردا دیوی نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر دہلی میں اکٹھے رہنے لگے تھے۔ سریتا تینوں کی لاڈلی تھی۔ وہ اسے گڑیا کی طرح بازوؤں میں جھلاتے پھرتے تھے۔ جب سے سریتا ہوسٹل میں رہنے لگی تھی گھر سونا سونا سا لگ رہا تھا تاہم اب بھی وہ سنیچر اور اتوار کو گھر ہی میں رہنا پسند کرتی تھی۔

ایک دن ڈاکٹر آنٹی نے بٹوارے کے وقت لاہور سے بھاگ آنے کا سارا ماجرا سنایا۔ سب سے بڑا بھائی پہلے ہی اپنی فیملی لے کر نقل مکانی کر چکا تھا۔ البتہ ڈاکٹر کملا دیوی، اس کی چھوٹی بہن اور امرناتھ ابھی لاہور میں ہی ہوا کا رُخ دیکھ رہے تھے۔ جب جان کے لالے پڑ گئے تو ایک فوجی میجر کی جیپ میں سرحد پار کر کے دہلی پہنچ گئے۔ کملا دیوی نے گھر کی کمان سنبھالی۔ رہائشی مکان کے ساتھ جڑی دکان پر پریکٹس شروع کر لی اور دھیرے دھیرے گھر کی خوشیاں واپس لانے میں کامیاب ہوگئی۔ بہر طور اس کے دل کا گھاؤ کبھی نہ بھر پایا۔ ہجرت کی داستان سناتے وقت آنٹی نہ روئی، نہ آہیں بھریں اور نہ جذبات میں بہہ گئی لیکن میں اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لگانے میں کامیاب ہوا۔ وہاں ایک خاموش طوفان برپا تھا۔ کون جانے آنٹی کے کتنے خواب ادھورے رہ چکے ہوں۔ کتنے شیش محل ٹوٹ چکے ہوں۔

اسی کابوس کے ڈر سے تینوں نے یہ فیصلہ لیا تھا کہ وہ شادی نہیں کریں گے۔ تاہم اپنے خلا کو پُر کرنے کے لیے کملا دیوی نے سریتا کو گود لیا تھا اور اسے نازوں سے پال رہی تھی۔ دیکھا جائے تو ان تینوں میں سے صرف ڈاکٹر کملا دیوی ہی فعال تھی۔ کلینک میں دن بھر مریضوں کا معائنہ کرتی کام کاج اور پھر اسی آمدنی سے گھر کا کام کاج چلاتی۔ چوکا چولہا، گھر کی دیکھ ریکھ بھی اکثر وہی کرتی۔ دوسری بہن فربہ بدن تھی اس لیے تھوڑا بہت ہاتھ بٹانے کے بعد ہی ہانپ کر بیٹھ جاتی۔ بھائی امرناتھ ایک دم شاطر اور چالاک تھا۔ بڑی ہنرمندی سے طفیلی زندگی بسر کر رہا تھا مگر دکھاوا ایسا کرتا جیسے سارے گھر کا بوجھ اکیلے اسی نے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا ہو۔

کملا دیوی کے خلوص، ایثار اور تارک النفسی کو دیکھ کر میں نے ایک روز ناشتے کے دوران اسے سوال کیا۔

''آنٹی اب تو آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ شہرت ہے، دولت ہے، سبھی سکھ سویدھائیں ہیں۔

سریتا بھی سال بھر میں ڈاکٹر بن جائے گی اور آپ کی یہ ذمے داری بھی پوری ہو جائے گی۔ پھر آپ مریضوں سے فیس کیوں لیتی ہیں۔ کم سے کم غریب لوگوں سے فیس نہ لیا کریں۔''

وہ زیر لب مسکرائی۔ پھر میری جانب توس اور مکھن بڑھا کر بولنے لگی۔

''بیٹے، تم سچ کہتے ہو۔ بھگوان کا دیا تو سب کچھ میرے پاس ہے۔ مگر اب دنیا عجیب سی ہو گئی ہے۔ ہمارے زمانے میں نزلہ زکام ہو جاتا تھا تو گھر پر ہی کوئی دیسی علاج کر لیتے تھے۔ اب کسی کو چھینک بھی آ جائے تو ڈاکٹر طلب ہوتا ہے۔ فیس دے کر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر کو خرید لیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو، جو بات بات پر ڈاکٹر کے پاس چلے آتے ہیں، دور رکھنے کے لیے مجھے فیس لینا پڑتی ہے۔ مارکیٹ کے حساب سے دیکھا جائے تو میری فیس بہت کم ہے۔ لیکن فیس کے باوجود رات میں ایک دو بار دروازے پر دستک ضرور ہوتی ہے۔ کئی بار مجھے آدھی رات کے سمئے نیند سے جاگ کر مریض کا معائنہ کرنے جانا پڑتا ہے۔ اگر فیس نہ لوں تو مجھے چوبیس گھنٹے گھر سے باہر ہی رہنا پڑے گا۔ فیس سے اتنا تو ہے کہ صرف سیریس کیسز کے لیے ہی لوگ بے وقت دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔''

انکل جو ڈائننگ ٹیبل کی دوسری طرف توس پر مکھن لگا رہا تھا کہہ اٹھا۔

''سریندر بیٹے، تم کیا جانو ہم ڈاکٹروں کی زندگی بڑی عجیب سی ہوتی ہے۔ نہ دن کو چین اور نہ رات کو آرام۔''

سریتا میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی جیسے کہہ رہی ہو یہ انکل کب سے ڈاکٹر بن چکا ہے؟ بہن کی کمائی پر تو پوری عمر گزار لی مگر باتیں بڑی بڑی کرتا ہے۔ میں اس کی آنکھوں کی بھاشا سمجھ گیا مگر چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

بہت دنوں کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ سنیچر کا دن تھا۔ میں تقریباً چار بجے آنٹی کے یہاں پہنچ گیا اور حسب دستور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ شاردا آنٹی اور امرناتھ انکل گھر پر نہیں تھے۔ اس لیے گھر میں قدرے خاموشی تھی۔ ابھی سریتا بھی ویک اینڈ پر گھر نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر کملا دیوی کلینک میں بیٹھی کسی نوجوان لڑکی کا معائنہ کر رہی تھی۔ مجھے ان کی گفتگو ڈرائنگ روم میں سنائی دے رہی تھی۔

''ڈاکٹر کچھ بھی کیجیے، میرا حمل گرا دیجیے۔ آپ جتنا روپیہ لینا چاہیں میں دینے کو تیار ہوں''

''نو سوری۔ میں ابارشن نہیں کرتی۔ آپ غلط جگہ پر آئی ہیں۔''

''آنٹی، میری ماں آپ کی بہت بڑی فین ہے۔ اس کے منہ سے ہمیشہ آپ کی تعریف سنتی رہتی

ہوں۔ وہ تو کہتی ہیں کہ ڈاکٹر کملا دیوی سچ مچ دیوی کا روپ ہیں۔ میں نے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔ پلیز آنٹی پلیز، مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلا دیجئے۔ میں نے شادی سے پہلے ایسی غلطی کر کے بہت بڑی بھول کی۔ میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہ جاؤں گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لڑکا بھی کہیں مجھ کو چھوڑ نہ دے۔''

''بیٹی، یہ میرا کام نہیں ہے۔ تم نے جو غلطی کی ہے اس کا تمہیں احساس ہو گیا، یہی کیا کم ہے۔ مگر میری اپنی کچھ سیمائیں ہیں۔ میں نے پوری عمر کبھی ایسا کام نہیں کیا۔ اس وقت بھی نہیں جب سینکڑوں اغوا شدہ عورتیں پھولے ہوئے پیٹ لے کر میری پاس چلی آتی تھیں۔ آئی ایم سوری۔ تم جا سکتی ہو۔''

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی اور بوجھل قدموں سے واپس چلی گئی۔ آنٹی کے چہرے پر غم و غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ صوفے میں دھنس کر بیٹھ گئی۔ مجھے پہلی بار اس کے چہرے پر تناؤ محسوس ہو رہا تھا۔

''سی دِس گرل۔ ابھی سکول چھوڑا ابھی نہیں ہے کہ پیٹ میں بچہ لے کر گھوم رہی ہے اور پھر مجھے روپے کا لالچ دے رہی ہے۔ جیسے روپے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔''

آج پہلی بار آنٹی نے اپنی پروفیشنل پرابلم کے بارے میں گھر میں اظہارِ خیال کیا تھا اور وہ بھی میرے سامنے۔ میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ تناؤ میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ میں بہت دور سے آیا ہوں اور شاید پانی یا چائے کا طلبگار ہوں۔ تاہم میں نے ہمت جٹا کر اپنے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

''آنٹی، اس میں ہرج ہی کیا تھا۔ بے چاری سے بھول ہو چکی ہو گی۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر کے سوا وہ کس کے پاس جا سکتی ہے۔ پھر وہ آپ کو منہ مانگے دام بھی دینے کو تیار تھی۔''

مجھے پورا یقین تھا کہ آنٹی میرا سوال سن کر بھڑک اٹھے گی اور مجھے برا بھلا کہہ کر خاموش رہنے کی ہدایت دے گی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کا موڈ دھیرے دھیرے بحال ہو چکا تھا اور وہ بڑے ہی متین انداز میں فرمانے لگی۔

''بیٹے، زندگی میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اگر میں چاہتی تو یہاں آنے کے بعد ایسے کاموں سے لاکھوں روپے کما سکتی تھی۔ مگر نہیں۔ میرے سنسکار مجھے یہ سب کچھ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بیٹے، میں نے زندگی دینے کے لیے جنم لیا ہے، زندگی لینے کے لیے نہیں۔ زندگی لینے کا اختیار تو صرف اوپر والے کو ہے اور کسی کو نہیں۔ میرے خیال میں ابارشن کرنے سے بڑا پاپ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''مگر آنٹی، دنیا میں بہت سارے ڈاکٹر یہ کام کرتے ہیں۔ کیا ان میں پیشہ ورانہ دیانت داری نہیں ہوتی؟ کیا وہ سب نرک میں چلے جائیں گے۔''

''یہ ان کی سوچ ہے بیٹے۔ میں ان کی نگہبان تو ہوں نہیں۔ میرے خیال میں اسقاط حمل صرف اس صورت میں جائز ہے جب بچے یا ماں کی زندگی پر کوئی خطرہ منڈلا رہا ہو اور پھر ابھی حمل ٹھہرا ہی ہو، بچے کی شکل اختیار نہ کر چکا ہو۔ ورنہ میں اسے قتل سے کم نہیں سمجھتی۔''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں آنٹی۔ میں تو بس یوں ہی اس لڑکی کی مجبوریوں کو آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خیر جانے دیجئے اس موضوع کو۔ کچھ اور بات کریں۔''

''بیٹے، میں گذشتہ تیس برس سے پریکٹس کر رہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے مجھے اپنے پیشے میں سب سے زیادہ خوشی کب ہوئی؟ ایک روز میرے پاس یہیں دلی میں ایک جوڑا آیا۔ عمر کچھ پینتیس کے قریب تھی۔ شادی کیے ہوئے سولہ سال ہو چکے تھے مگر کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے بہتیرے ڈاکٹروں سے صلاح مشورہ کیا تھا۔ صوفیوں سنتوں کے دروازے پر متھا ٹیکا تھا۔ نذر و نیاز کیے تھے۔ مگر ہر جگہ ناکام ہو چکے تھے۔ پھر کسی کی صلاح پر وہ میرے پاس آئے۔ میں نے عورت کا پوری طرح معائنہ کیا۔ میرے اندر سے کوئی غیبی آواز آئی کہ اس کے رحم کی صفائی کر کے اور کچھ احتیاط برت کر کوششیں کی جاسکتی ہیں۔ دو چار روز اس کے اعضا کی بھرپور صفائی کرتی رہی۔ کچھ دوائیاں بھی لکھ کر دیں۔ وہ مسلسل میرے پاس دس پندرہ روز کے بعد آتی رہی اور پھر ایک روز میں نے حمل ٹھہرنے کی خوشخبری اس کو سنائی۔ اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا اور نو مہینے بعد اس نے ایک ننھے منے بچے کو جنم دیا۔ یہ میری زندگی کی معراج تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بھگوان نے مجھ پر اپنی کرپادرشٹی ڈال دی ہے اور اسی لیے میں سرخرو ہو سکی۔

آنٹی کی باتیں سن کر میں حیران ہو گیا۔ اس کے خلوص، نیکی اور لگن کو دل ہی دل میں سراہتا رہا۔

دریں اثنا سریتا آئی اور گھر میں رونق سی چھا گئی۔

اس بات کو کئی سال گزر گئے۔ نہ سریتا میری بن سکی اور نہ میں اس کا۔ ڈاکٹر سریتا کسی ہم پیشہ سے بیاہی گئی اور اس کے گھر کے ساتھ میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ پھر دس بارہ سال بعد میری پوسٹنگ دہلی ہوئی۔ ڈاکٹر سریتا سے فون پر بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ آنٹی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ خبر سنتے ہی میں سکتے میں آ گیا۔

دوسرے دن میں تعزیت کے لیے موتی نگر پہنچا۔ کلینک کے کواڑ بند تھے۔ میں نے بہت دیر تک دروازہ کھٹکھٹایا۔ آخر کار اندر سے آواز آئی۔

''کون..........؟''

میں نے آواز پہچان لی۔

''میں......سریندر.....انکل دروازہ کھول دو......!''

اور پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولتے ہی انکل بولنے لگا۔

''بیٹے۔ دِلّی اب وہ دِلّی نہیں رہی۔ یہاں تو آئے دن بوڑھے لوگوں کو گھر میں اکیلا پا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور پھر گھر کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ تمہاری آنٹی تو ہم کو اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ سریتا نے بھی اس کی موت کے بعد پھر کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھا۔ ہم دونوں کو بہت ڈر لگتا ہے۔ بس کام والی پچھلے دروازے سے آتی ہے اور کوئی نہیں۔ کلینک کا دروازہ تو اب کھلتا ہی نہیں۔ شکر کرو کہ میں نے تمہاری آواز پہچان لی، اسی لیے دروازہ کھول دیا۔

میں کلینک سے ہوتا ہوا اندر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ سارا ماحول متعفن تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس مکان کی صفائی صدیوں سے نہیں ہوئی ہے۔ ہر جگہ جالے ہی جالے نظر آ رہے تھے۔ الماریوں میں رکھی چیزوں پر گرد جم گئی تھی۔ اتنے میں شاردا آنٹی کراہتے ہوئے بیساکھیوں کے سہارے چل کر بیڈ روم سے باہر آئی اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

پھر دونوں گزرے ہوئے برسوں کی روداد سناتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور الفاظ حلق میں اٹک رہے تھے۔

یہ وہی گھر تھا جہاں میں نے جہد زیست کا پہلا سبق حاصل کیا تھا، جہاں میں نے زندگی جینے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا اور جہاں میں نے نیکی اور بدی کے درمیان تمیز کرنا سیکھا تھا۔ آج اس گھر میں ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اس گھر سے روح ہی نکل چکی ہے۔



بُدھ کی مسکراہٹ

کل رات میں نے سِدھارتھ کو پھر ایک بار اپنے پران تیاگتے ہوئے دیکھا۔ یوں تو اس کی موت کوئی اہم خبر نہیں تھی تاہم ہنگامی حالات نے اس ادنیٰ آدمی کی موت کو بھی اخباروں کی سرخی بنایا۔ اس کا نام سِدھارتھ کاک تھا مگر لوگ اسے سِدکاک کے نام ہی سے جانتے تھے۔ ذات کا براہمن تھا۔ اکیلی مجرد زندگی جی رہا تھا۔ اچانک دَمے کے مرض نے دھر دبوچا اور زندگی عذاب بن کر رہ گئی۔ اس سِدھارتھ نے خود اپنی ہی زندگی میں دکھوں کو بھوگا تھا۔

وہ کپل وستو کا شہزادہ تھا نہ سُدھودن اور مہامایا کا لاڈلا جس کو دُکھ درد، بیماری اور بڑھاپے سے دور رکھنے کے لیے لاکھوں جتن کیے گئے تھے مگر پھر بھی ہونی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سِدھارتھ تو رات کی تاریکی میں بیوی بچے کو چھوڑ کر اُجالے کی تلاش میں نکلا تھا۔ الوداعی لمحات میں وہ سانس روکے بہت دور تک اپنے کوچوان چنّا اور گھوڑے کنتھکا کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

راہِ نجات یونہی حاصل نہیں ہوتی۔ عرفان حاصل کرنے کے لیے اور سِدھارتھ سے گوتم بننے کے لیے اس نے کئی آزمودہ نسخے اپنائے مگر روح کی بے چینی برقرار رہی۔ اس نے آخر کار اجتہادی راہ دریافت کی اور گوتم سے بُدھ بن گیا۔ اس نے روایتی بتوں کو مسمار کیا، نرآکار ایشور کو پوجنے کا درس دیا اور صرف صحیح فکر و عمل کی تلقین کی۔

گوتم کو زندگی کا سفر بے سنگ میل لگ رہا تھا۔ بس فریب اور مایا......! وہ آواگون کے چکر سے مُکت ہونا چاہتا تھا کیوں کہ تناسخ کے عمل میں اُسے پاؤں کی بیڑیاں نظر آرہی تھیں۔ انجام کار ہستی اور نیستی ایک دوسرے سے گلے مل گئے اور گوتم کو موکش پراپت ہوا۔ تاہم اس کا تصور دنیا میں باقی رہ گیا۔ عقیدت مندوں نے اس کی پرستش شروع کی۔ سنگ تراشوں نے اس کے بت بنائے اور شاکیہ منی پتھروں میں جاگ اٹھا، تصورات میں نمودار ہوا اور قصے کہانیوں میں جا بسا۔ پُر اسرار، متین اور پُر سکون!

انسان پیغمبروں کو تو پوجتا ہے مگر ان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چلتا......!

قاتل انگلی مال اور اولا دخور اَلاوِکا کو راہ راست پر لانے والا امن کا پیغامبر پوکھران کے ایٹمی دھماکے کے دوران کیسے مسکرایا ہوگا؟ ہم نے اس تجربے کو 'بُدھ کی مسکراہٹ' کا لیبل لگایا مگر ہم یہ کبھی نہ جان پائے کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے کتنی چبھن تھی، کتنا درد تھا اور کتنا طنز تھا۔ ہم یہ بھول ہی گئے کہ بُدھ نے تو کب کا نروان پراپت کیا ہے۔ اب وہ جنم کیسے لے سکتا ہے اور پھر سے کیسے مسکرا سکتا ہے......!

اُدھر سورگ میں گوتم چنّا سے کہہ رہا تھا۔ ''انہوں نے میری روح کو زخمی کر دیا لیکن پھر بھی جتا رہے ہیں کہ میں مسکرا رہا ہوں۔''

''میں تو مورکھ ہوں بھگون، مجھے یہ سب کہاں سمجھ میں آتا ہے'' چنّا نے آنکھیں نیچی کر کے جواب دے دیا۔

اِدھر وسطی افغانستان میں کسی مجسمہ ساز نے بامیان وادی میں گوتم بدھ کی صورت گری کرنے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھ لیا۔ پسینے میں تر بتر وہ فرہاد کی طرح پہاڑ کاٹتا رہا اور چٹان کو بت میں تبدیل کرتا رہا۔ آزر کی ہر چوٹ تعمیر کی سیڑھی بنتی گئی اور یہی سیڑھی مجسمہ ساز کے لیے آنند اور مکتی کی راہ بنتی گئی۔

گوتم کے راستے میں دیودت بھی آیا اور اَجات شترو بھی۔ انہوں نے گوتم کے بدن کو تیروں سے چھلنی کرنا چاہا، مست ہاتھیوں سے روندنا چاہا مگر ناکام رہے۔ آخر کار انہیں بُدھ کی مسکراہٹ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

انسان کی خصلت کچھ عجیب سی ہے۔ کبھی ہار ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ زندہ گوتم بُدھ کی جو تسخیر نہ کر سکا وہ اس کے مجسمے سے انتقام لینے لگا۔ اس نے بت ہائے بامیان پر گولے اور بارود برسائے تاکہ انہیں نیست و نابود کر دے۔

دنیا کی مادیت پسند تہذیبوں سے دور شاکیہ منی نے ان دیو ہیکل مجسموں میں پناہ لی۔ وہ مجسمے کسی

عظیم بت تراش کے تصور، محنت اور لگن کی گواہی دے رہے تھے۔ مجسمہ ساز نے ان بتوں کو ہی اپنی عقیدت اور عبادت کا وسیلہ بنایا۔ سالہا سال سے اس فنکار کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں سیاح آتے رہے مگر ان بتوں نے کسی کا کچھ بھی نہ بگاڑا۔ نہ کسی کو مذہب بدلنے کی ترغیب دی اور نہ کسی کے عقیدے میں رکاوٹ پیدا کی۔ وہ صدیوں سے چپ چاپ کھڑے تھے، سرد ہواؤں سے جوجھ رہے تھے اور دنیا کو اس عظیم فن کار کی یاد دلا رہے تھے جس نے ان کی تجسیم کی تھی۔

بہر حال عسکری ذہن کو ان باتوں سے کیا سروکار! ماضی میں مصر کے اہرام اور ابوالہول بھی ان کی تخریب کا نشانہ بنے۔ ان مجسموں کو تباہ کرنے میں ہی انہیں نجات کا راستہ نظر آیا۔ انہیں لگتا تھا کہ یہ بت شیطانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ وہ خاموش سہی، بے ضرر سہی مگر ہیں تو بغاوت کی علامتیں۔ اس لیے پہلے فرمان جاری ہوا۔ پھر اس کے بعد فرمان پر عمل درآمد ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں مجسمے ریت کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے۔ دفعتاً بامیان کی وادی میں قہقہے گونجے جو ساتوں آسمانوں میں گردش کرنے لگے اور اِندرلوک میں دیوتاؤں کے قہقہوں کے ساتھ مدغم ہوئے۔

سورگ لوک میں گوتم بدھ سوچنے لگا۔ ''نروان حاصل کرنے کا یہ راستہ تو مجھے معلوم ہی نہ تھا۔'' پھر وہ من ہی من مسکرایا۔

وہاں جنت کے دروازے وقتاً فوقتاً کھلتے رہے۔ کبھی امن پسندوں کے لیے تو کبھی تباہی مچانے والوں کے لیے۔ کبھی معماروں کے لیے تو کبھی تخریب کاروں کے لیے۔ کبھی فنکاروں کے لیے تو کبھی بت شکنوں کے لیے............! جنت کے دروازے کسی پر بند نہیں ہوتے۔

البتہ کل رات جو موت واقع ہوئی تھی وہ گوتم کی نہیں بلکہ سِدھارتھ کاک کی تھی۔ اس کے بال بچے نہیں تھے۔ دو سال پہلے اس کی بیوی اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ سِد کاک کا کوئی سگا سمبندھی اب وادی میں موجود نہ تھا۔ سب دہشت زدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔

پڑوسیوں نے اخباروں میں خبر چھپوائی لیکن کوئی سامنے نہیں آیا۔ نہ ہی کسی نے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔ کرتا بھی کون، بیٹا یا بیٹی تو تھے نہیں پرائے لوگوں کو کیا پڑی تھی۔ زمین جائیداد ہوتی تو دور دراز کے رشتے دار قطار باندھے کھڑے ہو جاتے مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ سِد کاک نے سیدھی سچی زندگی بسر کی تھی۔ پروہت تھا، ججمانوں کے ہاں پوجا پاٹ کرتا تھا۔ ان سے جو کچھ مل جاتا اسے غنیمت جان کر اس پر گزر بسر کرتا۔ سِدھارتھ کاک گیان مارگی تھا، ویدوں پرانوں پر کافی عبور تھا۔ اس کے علاوہ جیوتش پر

بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ البتہ اس نے اپنے گیان کا کبھی ناجائز استعمال نہیں کیا۔ چند برسوں سے حالت اور بھی نازک ہو چکی تھی۔ سبھی ججمان ہجرت کر کے وادی سے باہر چلے گئے تھے اور جو تھوڑی بہت آمدنی مل بھی رہی تھی وہ اب بند ہو چکی تھی۔

لوگ تذبذب میں پڑ گئے کہ لاش کا کیا کیا جائے۔ لاش کفن دفن کا انتظار کر رہی تھی۔ کتنا مجبور ہوتا ہے اشرف المخلوقات اپنے آخری سفر کے وقت طغیانیوں سے سینکڑوں لاشیں گل سڑ جاتی ہیں۔ میدان جنگ میں ہزاروں لاشیں بے کفن رہتی ہیں۔ نہ پنڈت نہ مولوی، نہ تجہیز نہ تکفین۔ پھر بھلا وہ لوگ کیسے نجات حاصل کرتے ہوں گے۔

گھر کے سامنے دس پندرہ لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ایک پڑوسی نے دوسرے سے پوچھا:

''رحمٰن بھائی۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''کچھ تو کرنا ہی پڑے گا...... ایسا کریں...... شمشان گھاٹ سے ارتھی اٹھا کر لائیں۔ لاش کو غسل دے کر گھاٹ تک پہنچا دیں اور پھر داہ کرمی کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد وہ جانے اور اس کا خدا......''

جمال بٹ کو یہ بات صحیح لگی۔ بولا:

''ٹھیک کہا تم نے۔ داہ کرمی کو لکڑی وغیرہ کا خرچہ ہم دے دیں گے۔ باقی کارروائی وہ خود ہی کرے گا۔''

صلاح مشورہ کے بعد اس پنڈت کی لاش چار مسلمانوں کے کندھوں پر آخری سفر کے لیے چل پڑی۔ مذہب میں اس کارروائی کی اجازت تھی یا نہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔

سِد کاک کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ اُسے سِدھی پراپت ہو چکی تھی۔ موہ، مایا، لوبھ، آہنکار۔ ان سب بندھنوں سے وہ آزاد ہو چکا تھا۔ ہر دم گیان کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتا رہتا تھا۔ قناعت پسندی کا پیکر تھا وہ۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے سواگت کے لیے اِندر دیوتا خود ہی جنت سے پدھارے ہوں گے۔ یہ رسمیں، یہ باتیں اب اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔

اُدھر سورگ میں کپل وستو کا راج کمار گوتم اپنے کوچوان چنا سے دوبارہ ہمکلام ہوا۔

''چنا، یہ لوگ اتنے سوگوار کیوں ہیں؟''

''سوامی، یہ آدمی مر چکا ہے اور وہ اس کی لاش اٹھا کر لائے ہیں۔''

''لیکن وہ تو اس کے سگے سمبندھی نہیں ہیں۔ پھر یہ ماتم کیسا......؟''

''سوامی، وہ لوگ اس کے پڑوسی ہیں۔''

''چناّ......ان کا آپس میں کوئی خون کا رشتہ بھی تو نہیں......؟''

''سوامی...... میں تو مورکھ پرانی ہوں۔ مجھے یہ باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ آپ تو انتریامی ہیں۔ آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے۔ تبھی تو یہ مسکراہٹ آپ کے ہونٹوں پر تیر رہی ہے۔''



دس اِنچ زمین

زر، زمین وزن ۔ دنیا کی سبھی لڑائیوں کی جڑ۔ اور پھر زمین تھی بھی کتنی ۔ صرف دس اِنچ ۔ آپ سوچتے ہوں گے کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے گھبرائیے نہیں آگے قصہ سنیئے۔

یہ کہانی دو چچیرے بھائیوں کی ہے ۔ گردھاری لال اور جواہر لال ۔ دونوں کے مکان ، جو انہیں وراثت میں ملے تھے، ملحق تھے ۔ سوڈیڑھ سو سال پرانے لکھوری اینٹوں کے مکان ۔ بوسیدہ ٹپکتی چھتیں اور جھر جھر دیواریں ۔ سنا ہے وقت کے ساتھ ساتھ ان پر بھی دھول اور مٹّی جم گئی تھی ۔ پرانے زمانے میں جواہر لال کے مکان کا دروازہ براہِ راست عقبی گلی کی طرف کھل جاتا تھا لیکن اب اس کا کہیں نام ونشاں بھی نہیں ملتا ۔ حالانکہ اس کے مکان کے سامنے کافی بڑا صحن تھا مگر وہ چاروں جانب گھرا ہوا تھا ۔ اس کے برعکس گردھاری لال کے مکان کا دروازہ صحن کی جانب کھلتا تھا اور سیدھا سامنے والی گلی سے جا ملتا تھا جس کے باعث پڑوسیوں کو آگے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ تھا ۔ وقت کی گرد ایسی جم گئی کہ عقبی دروازہ زمین میں دھنس گیا اور گردھاری لال کی زمیں عام راستہ بن گئی ۔ البتہ اسے یہ احساس ہمیشہ کچوکتا رہا کہ یہ زمین اس کی ملکیت ہے ۔ کبھی کبھی وہ فخریہ انداز میں اعلان کر دیتا کہ اس کی زمین آگے گلی سے جا ملتی ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنے چچیرے بھائی کی ناکہ بندی کر سکتا ہے ۔ یہ بات الگ ہے کہ اس کا یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا ۔ ہوتا بھی کیسے؟ جو زمین برسوں سے راہِ عام بن چکی تھی اس پر پھر سے نجی

حق جمانا قانوناً ممکن نہ تھا۔ خیر دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا تھا۔ لوگ تو اس بات کو بھول چکے تھے مگر گردھاری لال کے لیے بھول پانا مشکل تھا۔

بہر حال اب مسئلہ کچھ اور ہی تھا۔ پڑوسیوں کے بیچ مسئلے پیدا ہونے میں کونسی دیر لگتی ہے۔ وہ چاہے انسان ہوں یا ممالک۔ چنانچہ گردھاری لال کی قسمت نے یاوری کی تھی اور اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل نظر آرہی تھی اس لیے پڑوسیوں کے دلوں میں جلن پیدا ہونا فطری تھا۔ کسی مغربی ملک کا باشندہ ہوتا تو اپنے کنبے کو ساتھ لے کر دنیا کی سیر کرنے چلا جاتا مگر مشرق کی روایتیں ان چیزوں کی اجازت کہاں دیتی ہیں۔ عمریں گزر جاتی ہیں تلاشِ تحفظ میں۔ پہلے گھر چاہیے، پھر چلنے پھرنے کے لیے موٹر چاہیے، اس کے بعد بیٹے بیٹیوں کی شادی کی فکر ستانے لگتی ہے۔ فرصت ملی تو پوتے پوتیوں کی بہار دیکھنے کو بھی جی کرتا ہے۔ اس پس منظر میں سیر سپاٹے فضول لگتے ہیں۔ گردھاری لال بھی لکیر کا فقیر نکلا۔ بنکوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اونچی دروں پر تجارتی قرضہ اٹھالیا اور لگا اپنے مکان کی ازسرِ نو تعمیر کرنے یا یوں کہیے اپنے چچیرے بھائی کی چھاتی پر مونگ دلنے۔

اس شہر کے میونسپل قانون بھی عجیب وغریب ہیں۔ اگر سارا مکان گرا دیا جاتا تو ایک چوتھائی زمین سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ دونوں طرف گلیوں کی چوڑائی کی خاطر دس دس فٹ کی زمین چھوڑنی پڑتی۔ اس کا واحد علاج بس یہی تھا کہ ابتدا میں بالائی دو منزلوں کو عارضی طور پر جوں کا توں شہتیروں کے سہارے کھڑا کیا جائے اور پھر مکان کی صرف پہلی منزل گرا کر اس کی ازسرِ نو تعمیر کی جائے جو بقول قانون سازوں کے مرمت کے زمرے میں آتا ہے۔ پہلی منزل بن جانے کے بعد ایک ایک سال کے وقفے پر دوسری اور تیسری منزل کی مرمت بھی اسی ڈھنگ سے ممکن تھی۔

گردھاری لال نے جونہی پہلی منزل کی تعمیر کا کام شروع کروایا سارے محلے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے اور جواہر لال کے مکان کے درمیان تقریباً دس انچ کا گیپ پیدا ہو گیا تھا۔ راج مستری نے شاقول لگا کر مکان میں پیدا ہوئی کجی کو کم کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کارروائی کو دیکھ کر جواہر لال کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس سے رہا نہ گیا اس لیے فوراً اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔

''آپ ایسا نہیں کر سکتے، یہ شگاف آپ کے مکان کے سبب نہیں بلکہ ہمارے مکان میں خم پیدا ہونے کے باعث پیدا ہو چکا ہے۔ اس لیے آپ اپنی دیوار دس انچ دور رکھیں تو بہتر ہوگا۔''

''یہ شگاف میرے مکان کے جھکاؤ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے مجھے اس کو بھرنے سے کوئی

نہیں روک سکتا۔'' گردھاری لال نے ٹکا سا جواب دیا اور مستری کو کام چالو رکھنے کا اشارہ کیا۔

سچ تو یہ تھا کہ اتنے برس بیت جانے کے بعد کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دراڑ کس طرح پیدا ہو چکی تھی۔ گردھاری کا کہنا تھا کہ دس انچ کا یہ فاصلہ اس کی ملکیت ہے اور وہ کسی حال میں بھی اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے عورتوں نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی بہانے ایک دوسرے کی کئی پیڑھیوں کی بیخ کنی کی۔ اس کے بعد مرد میدان میں اترے اور راست مغلظات پر اتر آئے۔ ننگی ناخوشگوار گالیاں۔ جن لڑکیوں کو چند روز پہلے بیٹی کہہ کر پکارتے تھے اب بیہودہ القاب سے نوازنے لگے۔ جواہر لال نے سارا محلّہ اکٹھا کر لیا مگر بات پھر بھی نہیں بنی۔ گردھاری لال کو اپنی قوتِ بازو کا علم تھا سو اس کا راج مستری بے خوف اپنا کام کرتا چلا گیا اور ایک ہی دن میں اس طرف کی دیوار کھڑی کر دی تاکہ جواہر لال کورٹ سے حکم التوا نہ لا سکے۔

جواہر لال نے جیسے تیسے یہ صدمہ برداشت کر لیا مگر اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین جاتا رہا۔ دو دن بعد اس کے ذہن میں یکا یک بجلی سی کوندی اور اس نے بازار سے کدال اور دیگر اوزار خرید لیے۔ اسی رات وہ دوسری منزل کی دیوار میں، جو گردھاری لال کی دیوار سے ملی ہوئی تھی اور جہاں اس کی رسوئی تھی، چمنی کے لیے بڑا سا چھید کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کہاوت مشہور ہے کہ ایک آدمی کے ہاں بیٹا نہیں تھا مگر پڑوسی کی حسد میں اس نے بیٹی کا ختنہ کروایا۔

رات بھر ہتھوڑے کی چوٹیں اور کدال کی ضربیں پڑوسیوں کے کانوں کو چھیدتی رہیں اور وہ لاچار یہ آوازیں سنتے رہے لیکن کچھ بھی نہ کر پائے۔ گردھاری لال نے کئی بار اٹھ کر کھڑکی کے باہر جھانکنے کی کوشش کی پھر بھی کوئی سراغ نہ پا سکا۔ دوسرے روز راج مستری کی مدد سے کچن کی چمنی کا رخ اسی جانب پھیر لیا گیا تاکہ سارا دھواں دو مکانوں کے بیچ والی دراڑ سے نکلتا رہے۔ اگلے روز جب گردھاری لال کی نظر شگاف میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں پر پڑی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے حسب دستور احتجاج کیا مگر جواہر لال کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ایک بار پھر قانون ہاتھ ملتا رہ گیا۔

اب مشکل یہ تھی کہ گردھاری لال کو دوسری اور تیسری منزل کی دیوار بنانے کے لیے قانوناً اس طرف دو فٹ کی جگہ چھوڑنا لازمی تھا اور اس میں اب کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

اس دوران جواہر لال نے کورٹ سے حکمِ التوا لایا جس کی رو سے گردھاری لال آگے مکان کا

کوئی بھی کام جاری نہ رکھ سکا۔ اس حادثے کو دس سال سے زیادہ گزر چکے ہیں مگر کورٹ نے آج تک کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ گردھاری لال کے مکان کی بالائی منزلیں ایسے لگ رہی ہیں جیسے کسی قالین پر پیوند لگا ہوا ہو۔

اس روز کے بعد دونوں پڑوسی ایک دوسرے سے کترا کر چلتے ہیں۔ ان کے افرادِ خانہ جو کل تک ایک دوسرے کو بھائی بہن کہتے تھے اب دِل ہی دِل میں گالیاں دے کر گزر جاتے ہیں۔ کئی بچوں کی شادیاں ہوئیں لیکن کیا مجال کہ پڑوسی اس میں شرکت کرتے۔ کئی بزرگ راہِ عدم کو ہو لیے۔ پھر بھی پڑوسیوں نے شرکت کرنا مناسب نہ سمجھا۔

دو مکانوں کے درمیان دس انچ کی یہ گیپ آج تک اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ شگاف دونوں پڑوسیوں پر خندہ زن ہے۔



یادوں کی مہک

جو چیز حاصل نہیں ہوتی اس کی خلش ہمیشہ کیوں رہتی ہے؟ اس معمے کو میں آج تک حل نہیں کر پایا۔ زندگی میں جو چاہا وہ مل گیا حالاں کہ میں نے کبھی ایسے خواب بُنے ہی نہیں جو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتے۔

۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ پرگتی وِہار میں ایشیا۔۷۲ نمائش شروع ہو چکی تھی۔ ان دنوں میں کشمیر ایمپوریم میں کام کرتا تھا۔ نمائش میں ایمپوریم کا بھی ایک سٹال لگا ہوا تھا۔ میں اور میرے دوست سلیم نے افتتاح کے وقت رسمی طور پر اسٹال میں حاضری دی گو ہمارا اس سٹال کے ساتھ کوئی براہِ راست واسطہ نہ تھا۔ پرگتی میدان جگمگا رہا تھا۔ سبھی سٹال دلہن کی طرح سجے ہوئے تھے۔ سواگت کے لیے خوبصورت گرل گائیڈس تعینات تھیں۔ سٹالوں میں اتنا ہجوم اُمڈ پڑا تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ دو چار گرل گائیڈس ہمارے سٹال میں بھی کام کر رہی تھیں۔ ہم نے اپنا تعارف پیش کیا۔

''ہیلو میں ہوں سلیم، منیجر کناٹ پلیس ایمپوریم'' سلیم سارا سے براہ راست مخاطب ہوا۔ اس کو دیکھ کر وہ پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گیا تھا۔

مجھے ایک مراٹھی لڑکی پر دل آ گیا۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور ہنس مکھ تھی۔ اس لیے میں نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں ہوں راجیو، منیجر اشوکا ہوٹل ایمپوریم''

''نائس ٹو میٹ یو، آئی ایم وندنا'' مراٹھی لڑکی نے جواب دیا۔

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئی۔ موقعہ پاتے ہی میں نے اسے کوفی پینے کے لیے مدعو کیا۔

''کیئر فار اے کپ آف کوفی''

''ابھی نہیں، ابھی تو بہت رش ہے۔ لنچ ٹائیم پر جائیں گے۔''

مقررہ وقت پر میں وندنا کو لے کر کوفی پینے چلا گیا۔ سامنے اشوکا ہوٹل کا اسٹال دکھائی دیا اور میں نے وہیں کا رخ کیا۔ وندنا کچھ گبھرا سی گئی۔ بولی۔ ''نو نو، یہ تو بہت ہی مہنگا ریستوراں ہے۔ وہاں جانا تو پاگل پن ہے۔ وہ آگے ریلوے کا ڈبہ دکھ رہا ہے نا۔ اس کے اندر ریلوے ڈیپارٹمنٹ نے بہت ہی اچھا ریستوراں کھولا ہے۔ اس میں چائے ناشتہ، لنچ ڈنر سبھی کچھ ملتا ہے۔''

پھر ہم اسی ریستوراں میں چلے گئے۔ ہم نے ڈوسا اور کوفی منگوائی اور اس دوران ایک دوسرے کو نہارتے رہے۔ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں سناتی رہی اور میں ہمہ تن گوش سنتا رہا۔

''میرا پورا نام وندنا نارائن راؤ گلکرنی ہے۔ میں مہاراشٹرن برہمن ہوں اور پونا میرا آبائی وطن ہے۔ لیکن اب ہم کئی سالوں سے کوئمبٹور میں سیٹل ہوئے ہیں۔ میرے پتا جی کپڑوں کے کارخانے کے مالک ہیں۔''

''اوہ آئی سی، اور تم کیا کرتی ہو؟'' میں سوال کر بیٹھا۔

''گریجویشن ان انگلش لٹریچر۔ آج کل چھٹیاں ہیں، سوچا نمائش کے بہانے دلّی بھی دیکھ لیں گے۔''

میں نے بھی اپنے بارے میں تفصیلات فراہم کیں۔ یہی کہ میں نے علمِ نباتات میں ایم اے اور بی ایڈ کیا ہے۔ ایمپوریم میں نوکری کر رہا ہوں مگر مطمئن نہیں ہوں۔ اس لیے محکمہ تعلیم میں اچھی سی نوکری ڈھونڈ رہا ہوں۔ ہم دونوں نے تھوڑی سی مدّت میں ہی اپنے دل کھول کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیے۔ مجھ پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوگئی کہ جاتے سمئے اپنا قیمتی لائیٹر اور چشمہ ریستوراں ہی میں بھول گیا۔ خیر دل کو سمجھانا پڑا کہ پہلا پہلا عشق ہے اتنا نقصان تو اٹھانا ہی پڑے گا۔ اُدھر سلیم نے سارا کو اپنے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

دو مہینے نمائش چلتی رہی اور اس دوراں میں ہر روز وندنا سے ملتا رہا۔ لنچ ہم دونوں اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ اس کے باوجود نہ میں نے کبھی پیار کا اظہار کیا اور نہ اُس نے۔ میں سوچتا تھا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ تو سمجھ ہی گئی ہوگی۔ اِدھر چند دوستوں نے رائے دی کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھولو ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی اور کبھی کبھی ان کو پھٹکار بھی دیا۔

ایک روز ہم کناٹ پلیس میں سیلر ڈسکوتھیک میں چلے گئے۔ہال میں گھپ اندھیرا تھا۔لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے تھرک رہے تھے۔چنانچہ میں نہ تو ڈانس جانتا تھا اور نہ ہی ایسے ماحول سے آشنا تھا، اس لیے ایک کونے میں وندنا کے سنگ بیٹھ گیا۔رومانس سے بھرپور ایسا ماحول تھا کہ ایماں مجھے روکے ہے اور کھینچے ہے مجھے کفر والی کیفیت ہوگئی۔دوستوں کے مشورے یاد آرہے تھے مگر میں فوراً اپنے ذہن کو جھٹک دیتا اور خود کو سنبھال لیتا۔ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم وہاں سے نکلے اور میں وندنا کو اس کی رہائش پر چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔

وقت کیسے بیت گیا معلوم ہی نہیں ہوا۔ایشیا۔۷۲ اختتام پذیر ہوا اور دوسرے روز وندنا کو جی ٹی ایکسپریس میں واپس جانا تھا۔اس روز میں وندنا کو لے کر سٹینڈ ارڈ ریستوراں میں چلا گیا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔اس درمیان اس نے قریب آکر دفعتاً اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

''راجیو، گذشتہ دو مہینوں میں ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب آگئے۔ایسا لگ رہا ہے جیسے جنموں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔''

''ہاں، اس میں کیا شک ہے۔مجھے تمہارا ساتھ بہت اچھا لگتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ نمائش ایسے ہی چلتی رہے....اور کبھی ختم ہی نہ ہو۔''

''ایک بات پوچھوں، برا تو نہیں مانو گے۔''اس نے ہمت جٹانے کی کوشش کی۔

''پوچھ لو، ایسی کیا بات ہے جو تم گھبرا رہی ہو....مجھے تمہارا کوئی بھی سوال بُرا نہیں لگے گا۔''

''راجیو، تمہارے اور میرے بیچ کیسا سمبندھ ہے.....؟''اس کی ہمت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

''ہم اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ ہی رہیں گے۔''میں بھی اپنے دل کی بات بہت کوشش کرنے کے باوجود زبان پر نہ لا سکا۔دل چاہ رہا تھا کہ کہہ دوں میں تُم کو دل و جاں سے محبت کرتا ہوں۔پاکیزہ محبت، جس میں ہوس کی ذرا بھی آمیزش نہیں ہے۔مگر سوچا کہیں وہ برا نہ مان جائے۔میں جاتے سمے اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔میرے سنکوچ نے میرے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا۔

''لیکن میں تو تم سے پیار کرتی ہوں راجیو۔آئی لو یو فرام دی کور آف مائی ہارٹ۔''اس کے ساتھ ہی وہ زار و قطار رونے لگی اور اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا۔

میں سمجھ نہیں پایا کہ اسے کیسے چپ کراؤں۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس کے گال تھپتھپاتا رہا مگر وہ تو چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پھر میں اسے مخاطب ہوا۔ ''وندنا، میں بھی تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ اتنا پیار جس کا تم اندازہ بھی نہ لگا سکو گی مگر میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تمہارے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اس لیے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ہم اچھے دوست ہیں اس لیے میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ تم نے اچھا کیا کہ جانے سے پہلے اپنے دل کی بات بتادی۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا۔''

''مگر راجیو میری سمسیا کچھ اور ہے جس کا کوئی حل نہیں سوجھتا۔''

''مجھے بتادو شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ میرے والدین کٹّر مہاراشٹرن برہمن ہیں۔ بہت ہی روایت پسند۔ وہ ہم دونوں کی شادی کے لیے رضامند نہیں ہوں گے۔ کسی بھی صورت میں نہیں۔''

مجھے وہ سبھی قصے یاد آ گئے جن میں ایسے کئی جوڑوں پر رجعت پسند عناصر نے موت کا فرمان جاری کیا تھا۔ اب بال میرے کورٹ میں تھی۔ عجیب عجیب خیالات دل میں پیدا ہوئے۔ ''کیوں نہ میں کل صبح ہی اس کے ساتھ کورٹ میں شادی کرلوں!''۔ پھر اس حماقت پر خود ہی ہنسنے لگا۔ ''نہیں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا جسے وندنا کی عزت پر آنچ آئے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کے والدین کو کسی طرح منانے کی کوشش کروں۔'' اس کے بعد میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ''وندنا، تم کل واپس جا رہی ہو۔ گھر جا کر کبھی موقعہ ملے ماں باپ سے بات کرلو۔ یوں تو میں ناستک ہوں اور ذات پات کے بندھنوں میں یقین نہیں رکھتا تاہم ہماری شادی میں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ میں بھی کشمیری برہمن خاندان میں پیدا ہوا ہوں۔''

''نہیں راجیو تم انہیں نہیں جانتے۔ وہ میری شادی مراٹھی برہمن کے ساتھ ہی کریں گے اور کہیں بھی نہیں۔''

''تم کوشش کرلو۔ ابھی سے ہمت ہار بیٹھو گی تو پھر کوئی بات نہیں بنے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچ کر ضرور کوشش کروں گی اور تمہیں ان کے فیصلے سے آگاہ کروں گی۔ تم مجھ سے مسلسل خط و کتابت کرنا اور مجھے کبھی نہیں بھولنا۔''

''میں تمہیں مرتے دم تک نہیں بھول سکتا، اس بات کا مجھے یقین ہے۔''

دوسرے روز وہ جی ٹی ایکسپریس میں بیٹھی گاڑی چھوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے

چہرے پر عجیب سی تمتماہٹ پیدا ہوئی۔ گاڑی چھوٹنے کو تھی کہ اس نے آئین رینڈ کا مشہور ناول 'دی فاونٹین ہیڈ' مجھے تحفتاً دے دیا۔ اس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا 'بہت ساری محبتوں کے ساتھ، تمہاری پیاری وندنا' اس کے بعد اس کا ایڈریس اور دستخط ثبت تھا۔

تین مہینے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ ہر گھڑی کے ساتھ میرا تجسس بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس تھی تو کتنا سکون تھا مگر اب نہ جانے کیوں میرا چین بھی جاتا رہا اور آرام بھی۔ راتیں آنکھوں میں کٹتی اور دن اضطراب میں۔

پھر ایک دن میں نے ہی پہل کی اور اس کے ایڈریس پر خط روانہ کر دیا۔ جواب میں بس دس بارہ سطریں لکھ کر آئیں جس کا لب لُباب یہ تھا کہ اس کی ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنے والدین کو منا نہیں سکی۔ میرا خط اس کے والد کے ہاتھ جالگا تھا جس پر وہ بہت خفا ہوئے تھے۔ اس لیے آئندہ کسی خط و کتابت کی کوئی امید نہیں تھی۔

میرے دل میں ایک طوفاں سا اُٹھا۔ اپنے دوست کی بات رہ رہ کر یاد آ رہی تھی کہ بعد میں بہت پچھتاؤ گے جب وہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ دل میں طرح طرح کے سوال اُٹھ رہے تھے۔ کیا وہ سچ مچ مجھ سے پیار کرتی تھی؟ کیا اسے مجبور ہو کر اس رشتے کو منقطع کرنا پڑا یا پھر یہ سب ڈرامہ تھا، عشوہ گری تھی؟ بہت کوشش کے باوجود میں آج تک ان سوالوں کا جواب نہیں دے پایا۔ البتہ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سچے دوست تھے۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ جو مزہ خوابوں کی دنیا میں جینے کا ہے وہ حقیقت میں نہیں۔ آج اڑتیس سالوں کے بعد بھی اس کی یادوں میں کھو جانے سے یک گونہ اطمینان میسر ہوتا ہے۔ وندنا تو میری بن نہ سکی مگر اس کا ناول اور پہلا خط میں نے اب تک سنبھال کر رکھے ہیں۔ جب کبھی میں زندگی سے مایوس ہو جاتا ہوں تو اپنی لائبریری سے اس کا دیا ہوا ناول نکال کر پڑھتا ہوں یا پھر اس کا خط بار بار پڑھتا ہوں۔ آج بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے پاس ہے، ہم دونوں پرگتی وہار کی سیڑھیوں پر پاکیزہ کا وہ گیت گا رہے ہیں۔ 'چلو، دلدار چلو، چاند کے پار چلو، ہم ہیں تیار چلو۔' آج بھی وہ میری بغل میں بیٹھی شاید اس انتظار میں ہے کہ میں اس کو اُڑا کر عشق کی اس دُنیا میں لے چلوں جہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہ ہو۔



سرابوں کا سفر

مجھے وہ دن یاد آرہا ہے جب میں چنڈی گڑھ جانے کے لیے جموں کے بس سٹینڈ پر کھڑا تھا۔ میرے سامنے ایک ہاکر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّ رہا تھا۔

''آج کی تازہ خبر......آج کی تازہ خبر......راہل گاندھی نے ایک دِلت کی جھونپڑی میں رات گزاری اوراس کے ساتھ ہی رات کا کھانا بھی کھایا۔''

میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے رئیس زادے نے، جس کی تین پشتوں نے ہندستان پر حکومت کی تھی، جھونپڑی میں کیسے رات گزاری ہوگی......؟ اس نے رات بھر مچھروں اور کھٹملوں سے کیسے مقابلہ کیا ہوگا؟ اور پھر سوکھی روٹیاں، دال اور سبزی کیسے کھائی ہوگی؟ یہ مانا کہ آزادی کے بعد ہم نے جمہوریت کو گلے لگایا ہے، اپنی حکومتیں خود ہی چن لی ہیں مگر آج بھی ہم راجے مہاراجاؤں کے سامنے سر جھکا کر چلتے ہیں اور 'حکم، حکم' کہتے ہوئے ہماری زبان نہیں تھکتی۔

خیر تجربہ کامیاب رہا۔ غریبوں کی پریشانیوں اور سمیاؤں کا اندازہ لگانے کے لیے یہ طریقۂ کار مفید ثابت ہوا۔ بھری لوک سبھا میں کلاوتی اور اس کی کسمپرسی کا بیان ایسے دلگداز انداز میں کیا گیا کہ لوگ سحر زدہ ہو گئے اور سبھی اپنے زخموں کو کتوں کی طرح چاٹتے رہ گئے۔ ادھر عام آدمی کی حالت کو سدھارنے کے لیے سب پارٹی ورکر جٹ گئے۔

اخبار خرید کر میں چنڈی گڑھ والی بس میں بیٹھ گیا۔ ابھی بہت ساری نشستیں خالی تھیں۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ کب گاڑی بھر جائے اور چنڈی گڑھ کی طرف روانہ ہو۔ مجھے اسی روز وہاں پہنچنا ضروری تھا کیونکہ دوسرے روز ووٹر شناختی کارڈ بنوانے کی آخری تاریخ تھی۔ میں اس بنیادی حق سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

سامنے والے دروازے سے ایک دس گیارہ برس کا لڑکا کندھے پر پانی کی بوتلوں کا جھولا لٹکائے اندر داخل ہوا اور 'ٹھنڈا پانی، ٹھنڈا پانی' کہتا ہوا بس کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

''کیا زمانہ آیا ہے بیٹے۔ پہلے تو ہر سٹیشن پر صاف وشفاف پینے کا پانی نلوں میں مفت دستیاب ہوتا تھا۔ اب تو پانی کی بھی قیمت وصولی جا رہی ہے۔ کون جانے کب ہوا پر بھی پہرے بٹھائے جائیں گے۔ معلوم ہے بیٹے، میری پہلی تنخواہ بارہ روپے تھی۔ اتنی ہی جتنی اس بوتل کی قیمت ہے۔'' بغل میں بیٹھا ہوا بزرگ آدمی مجھ سے مخاطب ہوا۔

''انکل، آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ بھی تو سوچیے کہ آج معمولی سے معمولی کلرک کی آمدنی دس پندرہ ہزار سے کم نہیں ہوتی۔ میٹرک فیل کرکٹ کھلاڑی بھی سال بھر میں دو چار کروڑ کماتا ہے۔ فلم ایکٹروں، ماڈلوں، ٹی وی آرٹسٹوں، اینکروں، نیوز ریڈروں اور بزنس منیجروں کی تو بات ہی نہیں۔ ان کی آمدنی کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ جب آمدنی اتنی زیادہ بڑھ گئی تو ضروری ہے کہ قیمتیں بھی بڑھ جائیں گی۔'' میں نے بوڑھے آدمی کے جھریوں والے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''آمدنی تو نوکر پیشہ لوگوں کی بڑھ گئی بیٹے۔ کسانوں، مزدوروں اور ٹھیلے والوں کا کیا؟ پھر ان لوگوں کو بھی تو دیکھو جو کبھی ایک مِل میں کام کرتے ہیں اور کبھی دوسری مِل میں۔ کبھی ہڑتال کے سبب نوکری چھوٹ جاتی ہے اور کبھی لاک آؤٹ کی وجہ سے۔ بیٹے میری طرف دیکھو، مجھے نہ پنشن ملتی ہے اور نہ ہی مہنگائی بھتا۔ بچے روزی روٹی کی تلاش میں دوسرے شہروں میں جا بسے۔ خود اپنا پیٹ نہیں پال سکتے، میری مدد کیسے کر سکیں گے۔''

میں نے بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے اخبار کھول کر کالی لکیروں کے بھید جاننے میں مصروف ہو گیا۔ بوڑھا ان کہی باتوں کو تھوک کے ساتھ نگل کر چپ ہو گیا۔

دریں اثنا بس کے انجن کی آواز میرے کانوں تک آنے لگی اور آہستہ آہستہ تیز تیر ہونے لگی۔ میری ٹانگوں میں عجیب سا تسکین بخش ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ چند منٹوں کے بعد گاڑی فرّاٹے بھرتی

ہوئی چنڈی گڑھ کی طرف روانہ ہوگئی۔

دفعتاً میری نظر سامنے والی سیٹ پر بیٹھی عورت پر پڑی جس کا چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔اس کو دیکھ کر میں اتنا خوش ہوا جتنا کوئی چھوٹا بچہ کھلونا دیکھ کر ہو جاتا ہے۔

''اری سبھدرا،تم......تم یہاں کیسے؟''

''میں پنچ کلا اپنے سسرال جارہی ہوں۔اور تم......تم یہاں کیسے؟''

''میں دو سال سے چنڈی گڑھ میں نوکری کرتا ہوں۔اس سے پہلے کٹک اڑیسہ میں تعینات تھا۔''

''سچ،مجھے تو معلوم ہی نہیں......''

سبھدرا نے مسکراتے ہوئے بغل میں بیٹھے ہوئے آدمی سے درخواست کی کہ وہ میرے ساتھ سیٹ بدل لے۔وہ آدمی سحر انگیز مسکراہٹ کی تاب نہ لاکر یکایک کھڑا ہو گیا اور اپنی سیٹ خالی کردی۔ایک ذرا سی مسکراہٹ نے اس کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

''سبھدرا،لگتا ہے تم ماتا کے درشن کرنے گئی تھی۔''

''ہاں منّت جو مانگی تھی،سو اسے پورا کرنے چلی گئی تھی۔''

''کیسی منّت......؟''

''کیلاش،تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میری شادی ایک سیاسی خاندان میں ہوئی تھی۔تم سے بچھڑنے کے بعد میں سراپا سیاست بن گئی۔سسر جی پنجاب گورنمنٹ میں دس سال منسٹر رہے۔گھر میں ہمیشہ دولت کی ریل پیل رہی۔نوکر چاکر،گاڑی بنگلہ سب کچھ میسر تھا۔اگر کہیں کوئی سونا پن تھا تو وہ میری گود میں تھا۔میرے شوہر اپنی رنگ رلیوں میں مست رہتے مگر مجھے ہر دم یہ خدشہ رہتا کہ کہیں کسی دن وہ مجھے چھوڑ کر دوسری شادی نہ کر لے۔اس لیے میں نے یتیم خانہ سے ایک بچہ گود لے لیا مگر اس کی رگوں میں نہ جانے کس بدذات کا خون دوڑ رہا ہے۔اس نے تو میری ناک میں دم کر کے رکھا ہے۔اڑوس پڑوس کے سب لچے لفنگے اس کے دوست بن چکے ہیں۔پڑھائی میں اس کا من ہی نہیں لگتا۔آدھے سیشن کے بعد ہی کالج جانا بند کر دیا۔باپ نے بزنس میں ڈالنے کی کوشش کی،وہاں بھی ناکام رہا۔بھگوان کا شکر ہے کہ اب تک جیل کی ہوا نہیں کھائی۔باپ نے کئی بار اسے پولیس تھانے سے چھڑوا لیا۔اسی لیے میں نے ویشنو ماتا سے منّت مانگی کہ آنے والے الیکشن میں اسے پارٹی کی ٹکٹ مل جائے تو میں سادھارن شردھالوؤں کی طرح اس کے دربار میں حاضری دوں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اسے پارلیمنٹ الیکشن کے لیے پارٹی کی سیٹ مل گئی؟''

''ہاں، کشور کے پتا جی نے اعلیٰ کمان سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر میرے بیٹے کو سیٹ نہ دی گئی تو وہ پارٹی کے لیے کام نہیں کرے گا۔ پارٹی مجبور تھی کیونکہ پنجاب میں ان کی ساکھ داؤ پر لگی ہوئی ہے۔''

''لیکن سبھدرا اس کو پارٹی کی سیٹ ملی ہے نہ کہ اس کا انتخاب ہو چکا ہے۔ ابھی تو اصلی مرحلہ طے ہونا باقی ہے۔''

''ایسا نہیں ہے کیلاش۔ وہ پنجاب یوتھ برگیڈ کا سدسیہ ہے۔ میرے پتی شیام چودھری نے اپنی ساری طاقت اس الیکشن میں جھونک دی ہے۔ روپیہ پیسہ، آدمی جو کچھ بھی اس کے پاس ہے سب داؤ پر لگا دیا ہے۔ ایک بار کشور کے پاؤں سیاست میں جم جائیں تو پھر کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔''

''سبھدرا، پریشانیوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان کا کوئی انت نہیں ہوتا۔ خود اپنی طرف ہی دیکھو۔ ماں باپ نے یہ سوچ کر شادی کر لی تھی کہ امیر گھرانے میں وارے نیارے ہو جائیں گے۔ پھر یہ خلاء یہ سونا پن کہاں سے نمودار ہوا؟''

''تم سچ کہتے ہو۔ پریشانیوں کا کوئی انت نہیں ہوتا۔ باہر سے یہ سب سیاست دان کتنے خوش نظر آتے ہیں مگر ان کی ذاتی زندگی میں جھانکو تو حیرت ہوتی ہے۔ کسی کی لڑکی بھاگ جاتی ہے اور کسی کی بہو زہر کھا لیتی ہے، کسی کا بیٹا نشہ کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے اور کسی کا بھائی غنڈہ گردی کی پاداش میں جیل کی ہوا کھاتا ہے۔''

''سنا ہے اعلیٰ کمان نے حکم دیا ہے کہ سارے امیدوار اپنے حلقے میں عام لوگوں خصوصاً دلتوں کے ساتھ رہ کر ان کی کٹھنائیوں کے بارے میں فرسٹ ہینڈ معلومات حاصل کریں گے۔ ان کی جھونپڑیوں میں دو چار دن گزار کر ان کی صعوبتوں کا تجربہ حاصل کریں گے۔''

''تم نے ٹھیک سنا ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو چار روز میں کونسا پہاڑ ٹوٹ جائے گا۔ امیدوار حکم کی تعمیل ضرور کریں گے مگر ساتھ ہی جنگل میں منگل منائیں گے۔ ان کے لیے پہلے ہی سے کھانے پینے کا انتظام کیا جائے گا۔ بستیوں میں بسلیری کی بوتلیں پہنچا دی جائیں گی۔ جن جھونپڑیوں میں رہنا ہوگا وہاں اچھے بستر کا انتظام کیا جائے گا، مچھر دانیاں لگائی جائیں گی، مچھر مارنے کی دوائی چھڑکی جائے گی۔ بجلی نہ ہو تو جنریٹر سے ٹیبل فین چلائے جائیں گے۔ بس دو چار دن یہ اسویدھا اٹھانی ہی پڑے گی پھر پانچ سال عیش کرو۔ ایئر کنڈیشنڈ مکانوں میں رہو، ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں گھومو، فائیو سٹار

ہوٹلوں میں کھانا کھاؤ اور گرین ٹرف پر گالف کھیلو۔''

''یہ سب انتظام کون کرے گا؟''

''کون کرے گا۔ ضلع ادھیکاری تب تک کریں گے جب تک الیکشن کا اعلان نہیں ہوگا۔ اعلان ہوگیا تو پارٹی ورکر۔ پارٹی ورکر اتنے بیوقوف تو ہوتے نہیں کہ یہ چھوٹے موٹے انتظامات نہیں کروا سکیں گے۔''

''شراب وراب کا بھی انتظام ہوگا کیا؟''

''نہیں یہ ممکن نہیں۔ کچھ مان مریادا بھی تو ہوتی ہے۔ مانا کہ موجودہ نسل گاندھی جی کے نام سے بھی واقف نہیں ہے، پبلک سکولوں میں صرف جینز (Jeans) اور جیز (Jazz) سے متعارف ہوئی ہے، ائیر کنڈیشنڈ کاروں میں سفر کرتی ہے اور راتیں کلبوں کی نذر کرتی ہے پھر بھی سیاست میں رہنا ہے تو رعایا کو متاثر کرنے کے لیے کچھ گاندھیائی گُر تو سیکھنے ہی پڑیں گے۔''

تمہاری باتوں میں دم ہے سبھدرا۔ گاندھی اور اس کے اصول اس نسل کے لیے محض کھلونے ہیں جن سے وہ عام آدمی کو بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ البتہ مجھے تم کو دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ کہاں وہ آدرش وادی سبھدرا اور کہاں یہ اوسر وادی مسز چودھری!

''کیلاش، آدمی کو زمانے کے ساتھ بدلنا پڑتا ہے ورنہ زمانہ اس کو روند کر چلا جاتا ہے۔ میں نے اپنی غربت سے تنگ آکر ایک روز اپنے تن من کا سودا کر لیا۔ تم کو چھوڑ کر مسز شیام چودھری بن گئی۔ اب میں اسی غربت کو پھر سے گلے نہیں لگانا چاہتی۔''

''سبھدرا، مجھے تمہارے وہ نصب العین، وہ آدرش یاد آرہے ہیں۔ تم رابندر ناتھ ٹیگور کو اپنا آدرش مانتی تھی۔ تمہارے کمرے میں جہاں نظر پڑتی تھی وہاں گورو دیو کی تصویر لگی ہوتی تھی۔ تم نے بارہا ناظرین کو رابندر سنگیت سے محظوظ کیا۔ کبھی چھاؤں میں بیٹھ کر گیتانجلی کے اقتباسات سنایا کرتی تھی۔ کیسے کیسے خواب بُنے تھے تم نے اور اب یہ سب کیا ہے؟''

''اپنا من مار کر بالکل بدل گئی ہوں۔ اب یہی خیالات میرا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ ان ہی کے سہارے مجھے باقی سفر بھی طے کرنا پڑے گا۔ میری زندگی سے سنگیت ختم ہو چکا ہے۔ اب ان ریگ زاروں میں کہیں کوئی سراب بھی نظر نہیں آتا۔''

راستے میں گاڑی کئی بار رُکی۔ کبھی ناشتے کے لیے اور کبھی لنچ کے لیے۔ ہم دونوں نزدیکی

ریستورانوں میں بیٹھ کر آرڈر دے دیتے ۔ بیٹھتے ہی ایک دوسرے کا جائزہ لیتے اور نہ جانے کن خیالات میں گم ہو جاتے ۔لگ رہا تھا کہ ہم دونوں بچپن کے وہ لمحات دوبارہ جی رہے ہیں جو ہم سے قسمت نے چھین لیے تھے۔

باتوں باتوں میں نہ جانے کب ہم چنڈی گڑھ پہنچ گئے ۔وقت گزرنے کا کوئی احساس بھی نہ ہوا۔ ایک بار پھر ہم نے ایک دوسرے کو نم آنکھوں سے الوداع کہا۔

چار مہینے کے بعد الیکشن کے نتائج آنے والے تھے۔ چنانچہ سبھدرا کی یاد ابھی میرے دل میں تازہ تھی اس لیے میں ٹی وی پر الیکشن کے نتیجوں کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔صبح سات بجے ووٹ شماری شروع ہوئی۔ گیارہ بجے سے رجحانات آنے شروع ہو گئے ۔کشور چودھری اپنے مدمقابل سے کبھی آگے نکل جاتا اور کبھی پیچھے رہ جاتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرا اضطراب بھی بڑھنے لگا۔آخر کار دن کے دو بج کر دس منٹ پر اس کے نتیجے کا اعلان ہوا۔کشور چودھری جیت کا پرچم لہراتا ہوا ممبر پارلیمنٹ بن گیا۔

اُدھر پارلیمنٹ کے احاطے میں آلتی پالتی مار کر سکون سے بیٹھا ہوا مہاتما گاندھی کا مجسمہ بے صبری سے نئی نسل کے گاندھیوں کا انتظار کر رہا تھا۔



کبھی ہم سے سنا ہوتا!

اس روز عجیب سی بات ہوئی۔ اس نے بیچ سڑک پر مجھے گلے لگایا اور میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے وہ بولا۔

''مبارک ہو، مبارک ہو، تم نے سول سروسز کا امتحان پاس کیا۔ یہ تو ہم سب کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔''

پھر وہ اپنی بیوی سے، جو اس کے ہمراہ تھی، مخاطب ہوا۔

''اس نے تو زندگی کے پانچ قیمتی سال ہماری کارپوریشن میں ضائع کیے۔ مجھے پہلے ہی سے یقین تھا کہ ایک روز یہ بہت بڑا افسر بنے گا۔ اب دیکھو میرا اندازہ صحیح نکلا یا نہیں۔''

وہ امید بھری نگاہوں سے مجھے دوبارہ دیکھنے لگا اور کچھ لمحوں کے بعد اس نے مجھے گرینڈ ہوٹل میں چائے پینے کی دعوت دی۔

میری حیرانگی دوگنی ہوگئی۔ پانچ سال ہم ایک ہی دفتر میں کام کرتے رہے۔ کئی بار میں جگن ناتھ کے کمرے میں کسی نہ کسی دفتری کام سے جاتا رہا۔ کیا مجال اس نے کبھی چائے کا ایک کپ بھی پلایا ہو۔ جب دیکھو تب مسکینی صورت بنائے بیٹھا رہتا۔ پھر آج ایسی کونسی بات ہوئی کہ وہ محبتوں کی بارش برسانے لگا۔ میں اندر ہی اندر سوچنے لگا۔ ہوسکتا ہے اپنی بیوی پر میری دوستی کی دھاک جمانے کی کوشش

کر رہا ہو یا پھر کسی قریبی رشتے کی لڑکی کے لیے بَر ڈھونڈ رہا ہو۔ یہی چھوٹی چھوٹی غرض مندیاں آدمی کو باولا بنا دیتی ہیں۔

چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی کارپوریشن کی، کبھی نجی زندگی کی اور کبھی سیاسی منظر کی۔ اس دوران اس کی فربہ اندام بیوی مجھے کنکھیوں سے دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی۔ اس مسکراہٹ نے چائے کی مٹھاس اور بھی بڑھا دی۔

دو چار روز کے بعد جگن ناتھ اپنی بیوی سمیت میرے آفس میں وارد ہوا اور بیٹھتے ہی بے تکلف ہوا۔

"سریندر جی، آج ہم آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آئے ہیں"

"کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"میرا ہم زلف ہرجی لال آپ کے محکمے میں کام کرتا ہے۔ آج کل فرنٹیئر میں تعینات ہے۔ دوسرے مہینے اس کی واپسی کا آرڈر متوقع ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب کہاں پوسٹنگ چاہیے۔ گھر کے نزدیک کر دیں کیا؟"

'بھائی صاحب، یہی تو مصیبت ہے۔ وہ آدمی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس نے ہماری زندگی اجیرن کر لی ہے۔" بیوی اپنے شوہر کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "کیا بتائیں بھائی صاحب۔ دراصل وہ اپنی بھابی کے ساتھ پھنسا ہوا ہے۔ اسی کے پاس ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ اپنی بیوی کو گھانس بھی نہیں ڈالتا۔ بار بار اس کو میکے بھیج دیتا ہے اور خود اپنی بھابی کے ساتھ گلچھرے اڑاتا پھرتا ہے۔"

"سچ میں نے اس کی بلی جیسی چمکتی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ "یہ تو بڑی خراب بات ہے۔"

"بھائی صاحب، ہم چاہتے ہیں کہ ہرجی لال کو اس شہر سے دور ہی رکھا جائے۔ دو سال پہلے اس نے کورٹ سے طلاق منظور کروالی اور اب بچے کی کسٹڈی کے لیے درخواست دی ہے۔"

"بچہ ماں کے پاس ہی رہ سکتا ہے۔ باپ کو اس کی کسٹڈی کیسے مل سکتی ہے؟"

"نہیں صاحب۔ اس کے وکیل نے کورٹ میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس کی ماں کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے اور اب بچہ ماں کے دودھ پر منحصر نہیں ہے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کرنے کی نااہل ہے۔ لگتا ہے انہوں نے جج صاحب کو بھی کچھ کھلایا پلایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ آنے والی پیشیوں میں غیر حاضر ہوتا رہے اور پیشیاں ملتوی ہوتی رہیں جب تک لڑکا بالغ نہ ہو جائے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں اُس کو شہر سے دور ایسی جگہ پوسٹ کرلوں گا

جہاں سے سرینگر آنے میں کم سے کم دو دن لگ جائیں گے۔"

تسلی پاکر وہ دونوں اطمینان سے واپس چلے گئے۔ چند روز میں میرا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور میرے درون نے بغاوت کی۔

"تم نے صرف ایک طرف کی داستان سنی۔ تمہیں کیا معلوم کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ کم سے کم دوسرے فریق سے اس کا نقطۂ نظر تو دریافت کیا ہوتا۔"

بات معقول تھی۔ میں نے ڈیپارٹمنٹ کے چند بزرگ ملازموں اور یونین لیڈروں سے پوچھ گچھ کی۔ ان میں سے ایک یونین لیڈر نے میری آنکھیں کھول دیں۔ نتیجتاً میں نے اسی کے توسل سے ہرجی لال کو پیغام بھجوایا کہ وہ آئندہ کسی بھی چھٹی کے دن مجھ سے میرے گھر پر ملے۔

پندرہ روز کے بعد مسلسل دو تین چھٹیاں تھیں۔ اتوار کی صبح اس نے میرے گھر کی گھنٹی بجائی۔ چھٹی کے باعث میں ابھی سو ہی رہا تھا۔ بیوی بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی۔ سوچا دودھ والا یا اخبار والا بل لے کر آیا ہوگا۔ آنکھیں موندتے ہوئے میں بستر سے اٹھا، کرتے پائجامے کے اوپر پھرن پہن لیا اور پھر دروازہ کھولا۔ میرے سامنے ہرجی لال کھڑا تھا۔ میں اسے سیدھے بڑے کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر گھاس کی چٹائیاں بچھی تھیں اور ان کے اوپر نمدے بچھے تھے۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے۔ کشمیر میں عام طور پر مہمانوں کے لیے بڑا کمرہ مختص کیا جاتا ہے جس کو بیٹھک کہتے ہیں اور سردی کی وجہ سے کرسیوں کے بدلے فرش پر بیٹھنے کا رواج ہے۔ گھاس کی چٹائیاں حاجز کا کام کرتی ہیں اور فرش کی سردی محسوس ہونے نہیں دیتیں۔

"مجھے صاحب سے ملنا ہے۔ انہوں نے مجھے بلایا ہے۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ شاید میرے لباس کو دیکھ کر وہ یہ اندازہ نہ کرسکا کہ میں ہی اس کا باس ہوں۔

"تم ہرجی لال ہو، بیٹھو، میں نے ہی بلایا ہے۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"سر آپ......! مجھے معاف کردیں۔ میں نے پہچانا نہیں۔ دراصل پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا نا۔"

"اس میں معافی کی کیا بات ہے۔" میں بے تکلفی سے اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ "میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہاری ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرسکوں اگر تمہیں کوئی عذر نہ ہو تو۔ میں نے تمہارے سسرال والوں کی دلیل سن لی ہے۔ اب اگر تم اس پر کچھ روشنی ڈالنا چاہو تو بہتر رہے گا تاکہ میں کسی معقول فیصلے پر پہنچ جاؤں۔ میں ایک ہی فریق کی کہانی سن کر فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ آسمان سے گر کر زمین پر آ پہنچا۔ میرے لباس اور گھر کی سادگی کو دیکھ کر اسے کچھ اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کہاں تو وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ آئی پی ایس افسر سے ملنا ہے، نہ جانے کتنی دیر انتظار کروا کے ملاقات کا شرف بخشے گا اور پھر نہ جانے کیا سوالات کرے گا اور کیسے جوابات چاہے گا اور کہاں یہ بے تکلفی......!

میں نے پھر اسے تسلی دی تا کہ اسے یہ احساس ہو کہ میں اس کا خیر خواہ ہوں، کوئی دشمن نہیں۔ اس نے چاروں جانب ماحول کا از سر نو جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر پھر گویا ہوا۔

''سر بات یوں ہے کہ میں بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ میرے بھائی اور بھابی نے کبھی مجھے ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ بھابی نے بڑے چاؤ سے میری شادی کر لی۔ بڑے ارمانوں کے ساتھ بہو لائی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے کس بلا کو گلے لگایا ہے۔ میری بیوی نے قدم رکھتے ہی گھر کو کورو کھشیتر بنا دیا۔ بات بات پر بھابی سے لڑنے لگی تا کہ حالات ایسے پیدا ہوں کہ مجھے مجبوراً گھر سے الگ ہونا پڑے اور اس طرح اس کے کرتوتوں پر کسی کی نگاہ نہ پڑے۔''

''اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اکثر عورتیں مشترکہ خاندان میں رہنا پسند نہیں کرتیں۔ آج کل ہر عورت اپنی شناخت کی متلاشی ہے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''آپ کی بات اپنی جگہ صحیح ہے سر مگر سنسکار بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ تھوڑی بہت سوجھ بوجھ اور پیار محبت سے ہر کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ ہر روز گالی گلوچ، طعن تشنیع اور الزام تراشی سے کیا حاصل؟ حد تو یہ ہے کہ وہ ہم دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات ہونے کا الزام لگاتی ہے۔ ذرا سوچئے، میں جسے ماں کی طرح پوجتا ہوں اس کے خلاف میں ایسے الفاظ کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔''

''ہر جی لال، تمہارے رویّے سے تم پر لگا ہوا الزام سچ ثابت ہو سکتا ہے۔'' میں نے مزید کرید نے کی غرض سے تلخ کلامی سے کام لیا۔ ''تم اپنی بیوی سے لاپرواہ ہو کر بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتے ہو۔ بیوی میکے جاتی ہے، تم مڑ کر بھی اسے نہیں دیکھتے۔ نہ روکنے کی کوشش کرتے ہو اور نہ واپس بلانے کی۔ اس کے برعکس تم آرام سے اپنی بھابی کے ساتھ رہتے ہو۔ تمہاری بھابی تمہاری سکھ سویدھا کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے؟''

''سر، آپ مسئلے کا ایک ہی پہلو دیکھ رہے ہیں۔ کون مرد چاہے گا کہ اس کی بیوی میکے میں پڑی رہے اور وہ اکیلا اپنی جوانی بند کمرے میں ضائع کرتا رہے لیکن وہ ایسی ناگن بھی تو گھر میں برداشت نہیں

کر سکتا جو اس کا جینا حرام کر دے۔ رہی بات بھائی کے گھر میں پڑے رہنے کی۔ سر آپ ہی بتایئے۔ میرے پاس اور بھی تو کوئی چارہ نہیں ہے۔ موروثی مکان ہے۔ دونوں بھائی برابر کے شریک ہیں۔ ماں سمان بھابی جیسے اپنے بچوں کو پالتی ہے ویسے مجھے بھی دو روٹی ڈال دیتی ہے۔ میری حالت دیکھ کر وہ خون کے آنسو بہاتی ہے۔ کہتی ہے کہ میری لاپرواہی کے سبب ہی یہ بے جوڑ شادی انجام پائی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر میں اپنے بھائی کے ساتھ نہ رہوں تو کہاں جاؤں۔ میری بیوی کا کیا بھروسہ، نہ جانے زندگی کے کس موڑ پر دغا دے جائے۔''

''تمہارا کہنا غلط نہیں ہے مگر زندگی میں کبھی کبھار سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔''

''سر، سمجھوتہ وہاں ہوتا ہے جہاں دونوں طرف یہ احساس ہو کہ کہیں کوئی غلطی ہم سے بھی سرزد ہوئی ہے اور وہ اس کی تلافی کا خواستگار ہو۔ اب دیکھیے گذشتہ دس سال سے میری صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے اور کوئی سہارا نہیں۔''

فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی اس نے اپنی قمیض اوپر کھینچ لی اور مجھے اپنی پیٹ کا وہ نشان دکھایا جو آپریشن کے باعث باقی رہ گیا تھا۔ کم سے کم ایک فٹ لمبا نشان تھا۔ اس کے بعد وہ مسلسل بولتا چلا گیا۔

''سر چار سال پہلے مجھے پریشانیوں اور تناؤ کے سبب گیسٹرک اُلسر ہوا تھا۔ معدے میں تیزاب بڑھنے کے سبب چھید ہوئے تھے۔ پورے ایک مہینے ہسپتال میں پڑا رہا۔ میری بیوی نے کبھی بھولے سے بھی خبر نہیں لی۔ بھائی بھابی نہ ہوتے تو شاید میں کب کا مر چکا ہوتا۔''

''ایسا نہ کہو۔ بھگوان ہر پرانی کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی لیتا ہے۔ کیا اس وقت تمہاری طلاق ہو چکی تھی؟''

''نہیں سر، اس وقت میں بیوی کے لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارا ایک لڑکا بھی ہے۔ اسی کی امید میں جی رہا ہوں۔ سوچا اپنا خون ہے کبھی نہ کبھی ابال آ جائے گا۔ وہ ضرور باپ کو ڈھونڈے گا اور ماں کو بھی لوٹنے پر مجبور کر دے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ماں نے اسے ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ وہ مجھ سے بدظن ہو گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد ہی میں نے طلاق لینے کا فیصلہ کیا۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں۔ ایسی صورت میں واقعات یونہی رونما ہوتے ہیں۔''

''سر، میں آپ کو ایک اور راز کی بات بتانا چاہتا ہوں جو میرے سینے میں برسوں سے دفن ہے۔''

اس نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا جیسے ڈر رہا ہو کہ کہیں کمرے کی دیواروں میں کان نہ اُگ آئے

ہوں۔ اطمینان کر کے وہ پھر بولا۔ ''میں نے پچھلے بیس سالوں میں کبھی کسی سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی ہے مگر پتہ نہیں کیوں آپ کے سامنے دل کھولنے کو جی چاہتا ہے۔''

''تم کسی خوف کے بغیر کہو۔ تمہارا راز میرے پاس امانت رہے گا۔''

''سر اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کسی دن اپنی گلی سے باہر نکل کر سیدھے سڑک کراس کر لیں۔ سامنے ایک دوائی کی دکان، نیو گلوبل میڈیکیٹ ملے گی۔ وہاں پر آپ ہر روز تین سے پانچ بجے تک میری بیوی کو پائیں گے۔ دکان کا مالک اور وہ بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ان دنوں دکان کے مالک کی کوئی حیثیت نہیں تھی اس لیے والدین نے لڑکی کے لیے دوسرا شوہر ڈھونڈا۔ یہی وجہ تھی کہ میری زندگی ناسور بن کر رہ گئی۔ شادی کے بعد بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ اس رشتے پر پردہ ڈالنے کے لیے ہی میری بیوی نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ میرے چال چلن پر ہمیشہ انگلیاں اٹھاتی رہتی ہے۔ وہ انگریزی میں کہتے ہیں نا کہ اپنا بچاؤ کرنے کے لیے بہتر ہے دشمن پر حملہ کرو۔''

''اوہ میں سمجھا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ مجھے اس بارے میں سوچنے کی مہلت دو۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ لوں گا۔''

دوسرے روز میں آفس سے جلدی گھر لوٹ آیا اور معمولی سا گھریلو لباس اور ہوائی چپل پہن کر دوائی کی دکان پر پہنچ گیا۔ کاونٹر کے پیچھے پینتیس چالیس سال کا آدمی کچھ حساب لکھ رہا تھا۔ اس کی دائیں جانب دھانی ساڑی میں ملبوس چھوٹے قد کی گول مٹول سی عورت کرسی پر بیٹھی اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ کھکھلا کر ہنس بھی رہی تھی۔ وہ جگن ناتھ کی بیوی کی کاربن کاپی لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر دونوں ٹھٹھک گئے۔ میں نے دو تین دوائیوں کے نام گنائے اور ان کی دستیابی کے لیے استفسار کیا۔

دکان کے مالک نے پہلے تو میرا سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا ہوا الماریوں سے مطلوبہ دوائیاں برآمد کرنے لگا۔ اس دوران میں اس کی معشوقہ کو کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔

اس روز کے بعد میں پھر چار پانچ بار دوائیاں خریدنے کے بہانے اس میڈیکل دکان پر گیا اور ہر وقت ان دونوں کو اسی عالم میں پایا۔ کبھی کبھار کوئی خریدار آتا تو مالک اس کو نپٹ کر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ میرے ساتھ اب وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا تھا۔ ان چار پانچ ملاقاتوں میں مجھے ان دونوں کے بارے میں بہت ساری معلومات حاصل ہوئیں۔ ہر جی لال نے اپنی بیوی کے بارے میں جو کچھ

بھی کہا تھا وہ سولہ آنے سچ ثابت ہوا۔ میں نے اس عورت کا وہ روپ بھی دیکھا جس کو چھپانے کے لیے اس نے اپنے شوہر پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی تھیں۔

ایک ہی ہفتے کے بعد میں نے وہ کیا جس کی کسی کو امید نہ تھی۔ ہر جی لال نے جس دفتر کے لیے درخواست بھیجی تھی، اُسی دفتر میں اس کا تبادلہ کیا۔ جگن ناتھ اور اس کی بیوی پر کیا گزری ہوگی مجھے نہیں معلوم۔ میں نے اس بارے میں کبھی جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ نہ ہی اس کے بعد وہ کبھی مجھ سے ملے۔ البتہ ہر جی لال نے دفتر میں جوائن کرنے کے فوراً بعد میرے دفتر میں حاضری دی اور تہہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا۔

انہی دنوں میں ڈیپوٹیشن پر آرمی پوسٹل سروس میں چلا گیا۔ کامٹی میں ٹریننگ پانے کے بعد پہلی پوسٹنگ بریلی میں ہوئی۔ آٹھ نو مہینے گزر جانے کے بعد میں رخصت لے کر گھر چلا آیا۔ دل میں یہ خلش تو تھی ہی کہ پتہ کروں کہ ہر جی لال کا آخر کیا حشر ہوا۔ اس لیے ہر جی لال کے آفس پہنچ گیا۔ وہ اسی آفس میں کام کر رہا تھا جہاں میں نے اس کا تبادلہ کیا تھا حالانکہ مجھے اندیشہ تھا کہ اس کے سسرال والوں نے پھر کوئی چال چل کر اس کو شہر بدر کروایا ہوگا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کاونٹر چھوڑ کر میرے پاس آیا اور یکا یک اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''سر آپ، آپ کب آئے؟''

''بس دو ایک دن ہو گئے۔''

''سر آپ کو معلوم ہے۔ مجھے میرا بچہ واپس مل گیا۔ کورٹ نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا۔ بڑی مدت سے وہ لوگ مجھے شہر سے دور رکھنے کی ان تھک کوشش کر رہے تھے تا کہ میں کورٹ میں اپنے کیس کی پیروی نہ کر سکوں۔ مگر آپ نے تو میری مشکل آسان کر دی۔ میری لٹی ہوئی زندگی مجھے واپس دے دی۔ اب تو میرا بچہ میرے ساتھ کافی ہل مل گیا ہے اور باقاعدہ سکول بھی جاتا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں مسلسل آنسو رواں تھے۔ اس کے باوجود اس کے اندر کی خوشی ان آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ آنسو غم کے تھے یا پھر خوشی کے۔



ریزہ ریزہ حیات

سن ۲۰۰۰ء کی بات ہے۔ میں دوبارہ پوسٹنگ پر کشمیر آیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کل ہی یہاں سے ٹرانسفر ہو کر بروڈہ چلا گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے آٹھ سال گزر چکے۔ وقت کے جیسے پر لگ گئے تھے۔

ان برسوں کے دوران وادی ناسازگار حالات سے جوجھتی رہی۔ نہ ہوا میں وہ تازگی رہی تھی اور نہ پانی میں وہ مٹھاس۔ ہوا میں بارود کی تیز بدبو بسی ہوئی تھی جبکہ پانی میں شورے کی تیزابیت گھلی ہوئی تھی۔ مغل باغات میں بھی وہ پہلی سی چل پہل نہیں تھی اور نہ ہی کھیتوں میں وہ مدھر گیت گونج رہے تھے۔ اگر کچھ تھا تو بس سونی سڑکیں، پولیس چوکیاں اور ڈرے سہمے لوگ۔

حسب عادت میں صبح سویرے مارننگ واک کے لیے نکل پڑا۔ دریائے جہلم سوکھا سوکھا سا نظر آرہا تھا۔ جہلم کے کنارے بنا ہوا بنڈ، جس پر کسی زمانے میں سیاحوں کی قطاریں دکھائی دیتی تھیں، ویران سا لگ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر اکاّ دُکاّ آدمی سودا سلف لینے کے لیے چل پھر رہے تھے۔ دریا کی سطح پر ہاؤس بوٹ بڑی مدت سے سیاحوں کے لیے ترس رہے تھے۔ ان کی راتیں سیاحوں کی راہ تکتے کٹ جاتیں اور دن اونگھتے ہوئے گزر جاتے۔ کنارے پر لمبے اونچے سفیدے کے درخت چپ چاپ کھڑے ہاؤس بوٹ مالکوں کا غم بانٹ رہے تھے جبکہ درختوں پر بیٹھی چڑیاں واویلا مچا رہی تھیں۔ لگتا تھا

انہیں وہ منحوس صُبحیں راس نہیں آرہی تھیں۔ جو چہرے سرخ سیبوں جیسی رنگت کے لیے مشہور تھے ان پر یرقانی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

میرے ذہن میں محشر سا بپا ہو گیا۔ عجیب وغریب خیالات ایک کے بعد ایک اٹھتے رہے اور اپنے پیچھے کئی سوالات چھوڑ گئے۔ میں سوچنے لگا کہ ہم لوگ تو وادی چھوڑ کر جیسے تیسے جی رہے ہیں۔ نہ موت کا خوف اور نہ بندوق کا ڈر مگر جو لوگ یہاں رہتے ہیں ان پر اتنے برسوں میں کیا گزری ہوگی؟

دفعتاً میری نظر آگے چل رہے آدمی پر پڑی۔ بڑا مانوس سا چہرہ تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میرے گھر کے نزدیک مہاراج گنج میں اس کی دکان تھی۔ وہ علاقہ شہر کا تجارتی مرکز تھا جہاں پنجابی کھتریوں کی بڑی بڑی دکانیں ہوا کرتی تھیں جن میں زیادہ تر کپڑے، چائے، روئی اور نسوار کا تھوک بیوپار کیا جاتا تھا۔ اس نے آسمانی رنگ کا کرتا پائجامہ پہن رکھا تھا جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ کرتے کے اوپر واسکٹ تھا اور سر پر کنٹوپ۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں جمع ہو چکی تھیں۔ شاید کئی روز سے اس نے نہایا نہیں تھا۔ بائیں کاندھے پر بڑا سا جھولا لٹک رہا تھا جس میں سے وہ مٹھیاں بھر بھر کر چاول نکال رہا تھا اور اس کو سیمنٹ سے بنی ہوئی بنڈ کی ہموار سطح پر پھیلا رہا تھا۔ اناج کے دانوں پر نظر پڑتے ہی آکاش سے کوّے اور چڑیاں اتر آتیں اور دانے چگنے میں محو ہو جاتیں۔ وہ انہیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتا اور کچھ دور جا کر پھر وہی کارروائی دہراتا۔

ایک دو بار میں اس کے قریب سے گزر گیا اور اپنا سر ایسے ہلایا گویا اس کو نمستے کر رہا ہوں مگر اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید اتنے برسوں کی طویل مدت کے بعد وہ چہروں کی شناخت بھول چکا ہو۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ آٹھ ہی برسوں میں آدمی چہرے کیسے بھول سکتا ہے''میں نے خود سے ہی سوال کیا۔

وہ یک گونہ لاتعلقی ولاپرواہی کے ساتھ مجھے نظر انداز کرتا رہا جبکہ میں اس کی ہر نقل وحرکت کا غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی حرکتوں سے مجھے اس کے دماغی توازن پر شک ہونے لگا۔ وہ چہروں کو پڑھ نہیں پا رہا تھا یا پھر اس کا ذہن چہروں کی شناخت کرنے میں تحفظ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ شاید اسے خدشہ تھا کہ ان چہروں میں کہیں وہ چہرا نہ نظر آئے جس کی بدولت اس کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ اسے بخوبی یاد تھا کہ اس چہرے کی نشو ونما میں خود اس نے کئی جتن کیے تھے لیکن اس نے کبھی قیاس بھی نہ کیا ہوگا کہ جس

پیڑ کی وہ آبیاری کر رہا ہے وہ آخر کار کڑوا پھل دے گا۔

ایک روز وہ چہرہ اچانک اس کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے اپنا سارا بدن پھرن سے ڈھکا ہوا تھا۔ سر پر مفلر اس طرح لپیٹا تھا کہ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا مگر وہ پھرن کے اندر چھپا رکھا تھا۔ ساتھ میں دو اور ساتھی بھی تھے جن کا حلیہ بھی قریب قریب ویسا ہی تھا۔

اس وقت لالہ کرم چند اپنی دکان پر بیٹھا کچھ حساب لکھ رہا تھا۔ شہر میں تناؤ کے باعث گاہک عنقا ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ گذشتہ برسوں کا لیکھا جوکھا دوبارہ چیک کر رہا تھا۔ اب دکان کے ملازم بھی خال خال ہی آتے تھے۔ کبھی کرفیو کا بہانہ بنا لیتے اور کبھی تلاشی کا۔ وقت کی نزاکت سمجھ کر کرم چند کسی کو کچھ بھی نہیں کہتا۔ اب دکان پر یا تو وہ خود دکھائی دیتا یا پھر اس کے لڑکے۔

دکان پر چڑھتے ہی نوجوان نے ریوالور پھرن سے باہر نکالا اور اس کی نلی کرم چند کی طرف گھما دی۔ اچانک اس کے چہرے سے مفلر سرک گیا اور کرم چند نے اُسے پہچان لیا مگر مصلحتاً کچھ بول نہ پایا۔ نوجوان گرجدار آواز میں کرم چند سے مخاطب ہوا۔

"لالہ، اپنی سلامتی چاہتے ہو تو پانچ لاکھ روپے نکالو۔"

لالہ کرم چند کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ اس لیے نہیں کہ بندوق کی نوک پر وہ اسے پانچ لاکھ روپے مانگ رہا تھا کیونکہ رنگ داری کی ایسی وارداتیں تو آئے دن سارے ملک میں سننے کو ملتی تھیں۔ بلکہ اس لیے کیونکہ وہ خوفناک نوجوان اس کے اپنے ملازم کا بیٹا تھا جس کے پیدا ہونے پر اس نے مٹھائی بٹوائی تھی، جس کا سکول میں داخلہ کروایا تھا اور جس کو وہ ہر سال اپنے بچوں کی کتابیں بھجوایا کرتا تھا۔ وہی لڑکا حال ہی میں سرحد کے اس پار ٹریننگ کر کے واپس آیا تھا اور البدر تنظیم کا کمانڈر بن چکا تھا۔ کرم چند کو یاد آیا کہ اس کا ملازم گذشتہ دو تین مہینوں سے بہت ہی پریشان نظر آ رہا تھا مگر کسی کو کچھ بھی نہیں بتاتا تھا۔ بتاتا بھی کیسے! پھر تو سارے خاندان پر پولیس کا پہرہ لگ جاتا اور طرح طرح کی اذیتیں دی جاتیں۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں لالہ خبر ملتے ہی اس کو نوکری سے برطرف نہ کر دے۔ اس کے باوجود اس وقت جو حقیقت سامنے آئی اس نے لالہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

بہر حال اس حادثے نے لالہ کے ذہن میں کئی سوال پیدا کر دیے۔ "کیا باپ اپنے بیٹے کے کرتوتوں سے واقف ہے یا نہیں؟ کیا وہ بھی اس سازش میں ملوث ہے یا نہیں؟ نوجوان نے اس کو ہی

نشانہ کیوں بنایا؟''

لالہ ابھی سوچ ہی میں غرق تھا کہ نوجوان پھر غرّ ایا۔

''لالہ سوچ کیا رہے ہو۔ جلدی نکالو ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔''

لالہ گھبرا گیا۔ اس نے اپنی تجوری کھول کر دکھا دی۔ اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ حالات کے مدنظر وہ آمدنی کی رقم روزانہ بنک میں خود ہی جمع کرتا تھا۔ پھر ہمت کر کے وہ گویا ہوا۔

''آج کل بہت مندا چل رہا ہے۔ کوئی کمائی نہیں ہوتی۔ یہ دیکھو سب کچھ خالی پڑا ہے۔''

''لالہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں روپے چاہیے۔ یہ سب بہانے بازی نہیں چلے گی۔ آج سوموار ہے ہم کل نہیں پرسوں پھر آئیں گے اور پانچ لاکھ لے کر ہی جائیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔ اپنے پورے کنبے سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

لالہ کرم چند نے دوسرے روز بنک سے پانچ لاکھ نکال کر تجوری میں رکھ دیے۔ چنانچہ بدھ کا دن وصولی کے لیے مختص تھا اس لیے لالہ کو کئی قصبوں کا دورہ کرنا پڑا۔ اس نے دکان پر دونوں لڑکوں کو یہ ہدایت دے کر بٹھایا کہ اگر کوئی آدمی پانچ لاکھ روپے لینے کے لیے آئے تو اسے کسی حیل وحجت کے بغیر تجوری سے نکال کر دے دینا۔ باپ نے بچوں کو متوقع آدمی کا حلیہ بھی سمجھا دیا۔

دن بھر وہ ایک قصبے سے دوسرے قصبے پھرتا رہا اور دکانداروں سے پرانا حساب چکانے کے لیے اصرار کرتا رہا۔ شام ڈھلنے سے پہلے ہی وہ لوٹ آیا۔ اس کی دکان کے سامنے بھیڑ جمع تھی۔ وہ بہت پریشان ہوگیا۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہ دکان پر چڑھا۔ اس کے سامنے خون میں لت پت دونوں معصوم بیٹوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ کرسکا۔ دم بخود ہو کر وہ انہیں دیکھتا رہا۔ دفعتاً اس نے اپنی تجوری پر نظر ڈالی۔ اس کا دروازہ کھلا پڑا تھا اور اس میں سے سارے روپے غائب تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ ''اس نے روپے دینے سے انکار تو نہیں کیا تھا پھر یہ بربریت، یہ بہیمیت کس لیے......؟'' لیکن وہ اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا۔ جواب دینے والے تو لقمہ اجل بن چکے تھے۔

پولیس تھانیدار نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے سوال کیا۔

''لالہ، آپ کہاں گئے تھے؟''

کرم چند نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں وصولی کرنے شہر سے باہر گیا تھا۔''

''لالہ یہ وصولی کرنے کا کوئی وقت ہے۔ ساری وادی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ پھر ایسے حالات میں کون آپ کا قرضہ واپس کرے گا۔''

''حضور، ہمارا دھندہ ایسے ہی چلتا ہے۔ وصولی نہ ہو تو پھر کھائیں گے کیا؟''

اس کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ کھڑے کھڑے پتھر بن گیا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اس کے حلق سے آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر اس کے آنسو بہنے سے انکار کر رہے تھے۔ وہ اپنے بال نوچنا چاہتا تھا مگر اس کے بازو سیسے جیسے بھاری ہو چکے تھے۔

لمبے وقفے کے بعد اس کے کانوں سے پھر تھانیدار کی آواز ٹکرائی۔

''یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟ آپ کو کسی پر شک تو نہیں؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ دو روز پہلے تین مصلح نوجوان دکان میں گھسے تھے اور انہوں نے مجھ سے پانچ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں تھی، اس لیے انہوں نے آج آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے بنک سے رقم نکال کر تجوری میں رکھ دی تھی۔ چونکہ آج وصولی کے لیے جانا ضروری تھا اس لیے میں نے اپنے بیٹوں کو اہم ہدایات دے کر دکان پر بٹھایا تھا۔''

''آپ نے پولیس کو خبر کیوں نہیں دی؟ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''صاحب، سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں کیا جاتا۔ رہی پولیس کی بات۔ ان لوگوں نے مجھے وارننگ دی تھی کہ پولیس کو خبر دینے پر مجھے بال بچوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ میں نے غنیمت سمجھا کہ چلو پانچ لاکھ چلے جائیں مگر بال بچے تو سلامت رہیں گے۔''

''پولیس آپ کی حفاظت کر لیتی۔''

''پولیس کہاں کہاں پہنچ پائے گی۔ ہر طرف آتنک چھایا ہوا ہے۔ آپ ہر شہری کی حفاظت تو کر نہیں سکتے۔ اور پھر یہ تو ایک طرح کی جنگ ہے جو ہم لڑ رہے ہیں۔''

''اب دیکھیے وہ نہ صرف آپ کے روپے چھین کر لے گئے بلکہ آپ کے دونوں بیٹوں کو مار بھی دیا۔''

''اس کا تو مجھے وہم و گماں بھی نہیں تھا۔ ان کے ارادوں کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔''

کرم چند کے بیان کے بعد پولیس مزید تفتیش میں جٹ گئی۔ انگلیوں کے نشانات لیے گئے۔ جہاں کہیں بھی کوئی سراغ مل جاتا اسے اپنے قبضے میں لے لیتے۔ اس دوران کرم چند چپ چاپ بچوں کی لاشوں، دکان کی دیواروں اور اپنی تجوری کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب لاشیں لے کر وہ گھر پہنچا تو اس کی حالت اس ہارے ہوئے سپاہی جیسے تھی جو کسی طرح میدان جنگ سے اپنی جان بچا کر واپس آچکا ہو۔ لاشوں پر نگاہ پڑتے ہی اس کی بیوی کے منہ سے زوردار چیخ نکل پڑی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ طویل وقفے کے بعد اسے ہوش میں لایا گیا اور پھر وہ روتی رہی، بین کرتی رہی اور اپنے سر کے بال نوچتی رہی۔ اس کے باوجود کرم چند پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مبہوت کھڑا کسی سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ کہیں کسی طرف ایک قطرہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

دوسرے روز بوڑھے نحیف ہاتھوں نے بچوں کی چتاؤں کو آگ دکھادی اور مسلسل تیرہ دن رسم ورواج کے مطابق ان کا کریا کرم کرتے رہے۔

یہ حادثہ کرم چند کی زندگی کا پہلا اور آخری حادثہ تھا۔ وہ کھوکھلے پیڑ کی مانند یک لخت زمین پر گر پڑا۔ اس دن کے بعد جب بھی وہ بھوجن کرنے کے لیے فرش پر بیٹھ جاتا اور اس کی بیوی اس کے سامنے تھالی رکھ دیتی تو وہ ہمیشہ ایک ہی سوال کرتا۔

''سونو اور ببلو ابھی تک کھانا کھانے نہیں آئے کیا؟ انہیں دکان سے آنے میں آج بھی دیر ہو جائے گی کیا؟''

''آتے ہی ہوں گے جی، آپ روٹی کھا لیجیے۔ انہیں میں بعد میں کھلا دوں گی۔'' بیوی اپنے پتی کی دماغی حالت سمجھ گئی تھی۔ وہ ہر دم بھگوان سے یہی پرارتھنا کرتی کہ اس کے شوہر کی دماغی حالت سدھر جائے۔ حالانکہ خود وہ اپنے پتی سے بھی زیادہ غم زدہ تھی مگر ظاہراً وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتی رہی اور اپنے شوہر کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی۔ اس کے دل میں جو دکھ تھا وہ روز بروز اس کو کھائے جا رہا تھا۔ اس دکھ کو کم کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ انجام کار دو مہینوں کے اندر ہی اس کی حرکتِ قلب بند ہوگئی اور وہ بھگوان کو پیاری ہوگئی۔ کرم چند بالکل اکیلا رہ گیا۔

کئی بار میرے دماغ میں یہ سوال اٹھتا رہا کہ ایسی کیا بات تھی جس کی وجہ سے کرم چند نے نقل مکانی کرنے سے انکار کیا تھا۔ وادی سے لاکھوں لوگ ہجرت کر کے چلے گئے پھر وہ اپنی دھرتی پر ہی کیوں جما رہا؟ کیا باقی لوگوں کی بہ نسبت اس کو اپنی دھرتی سے زیادہ لگاؤ تھا یا پھر دولت کے لالچ میں اس نے اپنے سارے کنبے کو داؤ پر لگا دیا؟ میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں ناکام رہا البتہ دھیرے دھیرے مجھے یہ احساس ہوا کہ اپنے گھر، اپنی دھرتی کو چھوڑنے کا فیصلہ کتنا کٹھن ہوتا ہے۔

پھر ایک روز کرم چند نے دکان اور مکان دونوں اونے پونے داموں بیچ ڈالے۔ جتنی تھوڑی بہت رقم مل گئی اس کو بنک میں جمع کر لیا اور اسی کے سود پر اپنا پیٹ پالتا رہا۔ آخر تھا تو اکیلا ہی آدمی، پھر کوئی کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے آبی گذر کے پاس ایک جان پہچان والے کھتری کے گھر میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور وہیں پر اپنی زندگی کے بچے کھچے دن کاٹنے لگا۔

بہر حال جب سے اس کی دنیا لٹ چکی ہے، اس نے چڑیوں، کوؤں اور دیگر پرندوں کو اپنا ہم صفیر بنا لیا ہے۔ وہ اس کی بولی سنتے ہیں، اس کی بھاشا سمجھتے ہیں اور اس کی محبت پہچانتے ہیں۔ انہیں ہر صبح کرم چند کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔

ادھر کرم چند بھی ہر صبح بلا ناغہ چاول سے بھرا جھولا اٹھائے ان کو اپنی آہوں سے بلاتا ہے، اپنی سسکیوں سے پکارتا ہے اور اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں سے اناج کھلاتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ ان چڑیوں میں اس کی بیوی بھی شامل ہے اور اس کے دونوں بیٹے بھی جو اپنے باپ کے ہاتھوں کا کھانا کھانے کے لیے ترس رہے ہیں۔ انہوں نے چڑیوں کی صورت میں پھر سے جنم لیا ہے۔ کرم چند کبھی ایک چڑیا کو اور کبھی دوسری چڑیا کو 'سونو' اور 'ببلو' کے نام سے بلاتا ہے اور ان کے سامنے ڈھیر سارا اناج ڈال دیتا ہے۔



درد کا جنگل

اس گھر کے ساتھ میرا گہرا سمبندھ تھا۔ بیٹی سے زیادہ میں ماں سے پیار کرتا تھا جو رحم اور ہمدردی کی مورت تھی۔ اس کی شبیہ میں مجھے اپنی کھوئی ہوئی ماں یاد آتی تھی۔

گھر میں تین سن رسیدہ کنوارے رہتے تھے جنھوں نے ایک لڑکی کو گود لیا تھا اور وہ میرے پیار میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ تینوں بوڑھے۔ دو بہنیں اور ایک بھائی سن سینتالیس میں اپنی جانیں بچا کر لاہور سے ایک فوجی میجر کی جیپ میں بھاگ کر آئے تھے۔ بڑی بہن کملا دیوی نسائی امراض کی کامیاب ڈاکٹر تھی جبکہ چھوٹی بہن شاردا دیوی دانتوں کا علاج کرتی تھی۔ پیشہ ور ڈاکٹر ہونے کے باعث انہیں روزگار ڈھونڈنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ موتی نگر کے پاس لبِ سڑک ایک دُکان کرائے پر لے لیا جس کے عقب میں ایک مکان بھی ملحق تھا۔ دکان میں علاج معالجہ کا کام شروع ہوا جبکہ مکان میں تینوں بھائی بہن رہنے لگے۔ چار پانچ سالوں کے اندر ہی انہوں نے ساری جائیداد، جس کا مالک امریکا میں جا بسا تھا، اونے پونے داموں خرید لی۔ پھر پندرہ بیس برسوں کے بعد کچھ دوری پر ایک اور تین منزلہ رہائشی مکان آمدنی کو مزید بڑھاوا دینے کے لیے خرید لیا۔

اس کے برعکس بھائی بالکل نٹھلا بیٹھا رہتا۔ نہ کام نہ دھام۔ پوری عمر بڑی بہن کی کمائی پر زندہ رہا۔ اس نے اپنے ذمے بس دو ہی کام لیے تھے۔ ایک گھر اور کلینک کی صفائی کروانا اور دوسرا نوکروں پر

رعب بٹھانا۔ اس کے علاوہ جب کوئی مہمان آتا تو بڑی بڑی باتیں کر لیتا جیسے ساری دنیا کا گیان اسی نے اکٹھا کر کے رکھا ہو۔

مجھے اس کو دیکھ کر ترس آتا۔ کبھی میں ایسے طفیلی لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں کہ یہ لوگ کس بے شرمی کے ساتھ جی لیتے ہیں تو حقارت سے بدن میں جھرجھریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انکل تو خیر اپنی بہن کی کمائی پر جی رہا تھا، میں نے ایسے بھی بہتیرے لوگ دیکھے ہیں جو کماؤ لڑکی کے ساتھ شادی اسی غرض سے کرتے ہیں کہ آئندہ زندگی آرام سے گزرے۔ بیوی کماتی ہے جبکہ وہ خود اپنا سارا وقت جوئے اور شراب میں صرف کرتے ہیں۔ اس پر طرہّ یہ کہ رات کو بیوی پر کاہلی کا الزام لگا کر اسے ڈانٹتے بھی ہیں اور پیٹتے بھی۔ تھوڑا پڑھے لکھے ہوں تو محفلوں میں کسی کو منہ کھولنے بھی نہیں دیتے۔ کوئی بھی مضمون ہو، بے دھڑک اس پر رائے ظاہر کرتے ہیں اور اپنی تبحر علمی کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انکل بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھے جو ہر واردات کی خبر رکھتے۔ کس لڑکی کو کہاں سے اغوا کیا گیا، کس گھر میں بوڑھے میاں بیوی کا گلا کاٹ کر سارے گھر کو لوٹا گیا یا پھر کتنے معصوم بچوں کو کس کس جگہ پر ریڈ لائین بسوں نے کچل ڈالا۔ یہ ساری خبریں انکل کے پاس آل انڈیا ریڈیو سے پہلے پہنچ جاتیں۔ اسی طرح وہ بحث کے دوران ہمیشہ اس بات پر زور دیتے کہ پنڈت نہرو نے یو این او میں کشمیر کے مسئلے کو اٹھا کر بہت بڑی غلطی کی اور پھر اگر اس نے پاکستان سے آئے ہوئے ریفیوجیوں کو کشمیر میں بسایا ہوتا تو آج صورت حال کچھ اور ہی ہوتی۔

انکل کا اصلی نام امرناتھ تھا اور اس کا روزمرہ کچھ یوں تھا۔ مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ وہ جاگ جاتا، پانچ چھ کلومیٹر سیر کرتا، واپسی پر گھر کے لیے سودا سلف لے آتا، راستے میں کوئی مل جاتا تو اس کے ساتھ گپیں مارتا، پھر ناشتہ کر کے کلینک اور مکان کا جھاڑو پونچھا لگواتا، دوپہر میں لنچ کر کے قیلولہ کرتا اور رات گئے دوستوں یا مہمانوں سے بتیاتا۔ اس کے سوا اس کی نظر میں زندگی کا نہ کوئی نصب العین ہوسکتا تھا اور نہ کوئی مقصد۔ نہ اس نے کبھی ماضی کے زخموں کو چاٹنے کی کوشش کی، نہ حال کی اُلجھنوں میں پھنس گیا اور نہ ہی مستقبل کی کبھی فکر کی۔ سہل پسند زندگی کا اس سے بڑھ کر نادر نمونہ اور کیا ہوسکتا تھا۔

سن سینتالیس میں بٹوارے نے لاکھوں لوگوں کو نقل مکانی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُدھر سے ہندو جوق در جوق چلے آئے اور اِدھر سے مسلمانوں کا کارواں سرحد پار کرنے چلا گیا۔ بہت سارے تو راستے میں ہی لقمۂ اجل ہو گئے البتہ جو بچے وہ بے گھری اور بیگانگی کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ مصیبت زدہ

عورتوں کو اپنوں نے پہچاننے سے انکار کردیا۔ ان میں سے کچھ ہمت ہار کر بالا خانوں پر جا بیٹھیں مگر اکثر وبیشتر نے کمر کس لی اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھر لیا۔ پیسے کی اونچ نیچ، طبقاتی بالا دستی اور ذات پات سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔ جس نے جو ہنر سیکھ لیا وہ اسی کی ہو کر رہ گئی۔

بہر حال ہجرت نے ان لوگوں میں ایک مستقل تبدیلی لائی۔ بے گھری، بے توجہی اور بے نیازی کی وجہ سے پیسہ ان کا خدا بن کر رہ گیا اور سب رشتے ناتے بے معنی ہو کر رہ گئے۔

ملکی سطح پر بھی سرمایے کے بڑھتے ہوئے رول نے اس مادی نظریے کو تقویت بخشی۔ دہلی اس دولت پرستی کا منبع بن گیا۔ اس شہر کا قانون بدل گیا۔ جس کی لاٹھی، اس کی بھینس۔ قبضہ کرلو، زمین آپ کی۔ کرائے پر مکان لو، مکان آپ کا۔ بیچ راستے پر چلو، راستہ آپ کا۔ جیب کاٹو، ڈاکہ ڈالو، بلاتکار کرو یا پھر راہ چلتے مسافر کو روند ڈالو۔ سب جائز ہے۔

تینوں بوڑھے اسی جنگل کے باشندے تھے۔ پھر ان کے ساتھ گود لی ہوئی لڑکی ڈاکٹر سریتا بھی تو تھی۔ ڈاکٹر سریتا اس ماحول سے کیسے بچ پاتی۔ اس کے ساتھ شادی نہ کرنے کی وجہ غربت اور مالی حالت کے علاوہ شاید یہ بھی تھی کہ مجھے اس ماحول سے گھن آتی تھی۔ کہاں تو لاکھوں کی مالک، نازوں کی پلی اکلوتی لڑکی اور کہاں میں دوڈھائی سو مہینے کمانے والا ادنیٰ ملازم۔ مجھے ہمیشہ یہ ڈر رہا کہ اگر کل کو اسے کوئی اچھا ہم پیشہ مل گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر نہ جائے۔ اس وقت تو شاید وہ محبت میں اندھی ہو کر مجھے اپنا لے گی مگر کل کو جب حقیقت سے دوچار ہوگی تو دولت اور مرتبہ دونوں اسے پریشاں کرلیں گے۔ میں امرناتھ کی طرح طفیلی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

انکار کی صرف دیر تھی کہ سریتا کی شادی پریم سے طے ہوئی اور اس نے وہی کیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ اس نے دہلی کے ایک معروف سول سرجن کے بیٹے، جو خود بھی کامیاب ڈاکٹر تھا، سے شادی کرلی۔ دراصل ڈاکٹر سریتا کو کملا دیوی نے اپنے بڑے بھائی سے مانگ کر گود لیا تھا کیوں کہ تینوں بھائی بہنوں میں ایک وہی تھی جس کی باقاعدہ کمائی تھی۔ چھوٹی آنٹی تو نام کی ہی ڈاکٹر تھی۔ اس کی پریکٹس زیادہ نہیں چلی۔ بھائی تو خیر طفیلیا تھا ہی۔

شادی کے دوسرے سال ہی گھر میں ہنگامہ ہوا۔ ڈاکٹر کملا دیوی بھگوان کو پیاری ہوگئی اور باقی دونوں کنوارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ابھی چتا کی راکھ ٹھنڈی بھی نہ ہوئی تھی کہ جائیداد کے بٹوارے کی بات چل پڑی۔

رات کو جب گھر میں صرف چھوٹی آنٹی، انکل، سریتا اور پریم موجود تھے تو ڈاکٹر سریتا نے بات چھیڑ لی۔
''انکل، ہم بہت دنوں سے سعودی عرب میں نوکری کرنے کی سوچ رہے تھے مگر اب ممی نہیں رہی۔ اس لیے سوچا کیوں نہ دہلی ہی میں اپنی پریکٹس شروع کرلیں۔''
''بیٹی، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہم بھی تو چاہتے ہیں کہ ہماری بیٹی ہر پل ہماری آنکھوں کے سامنے رہے۔ تم لوگ آنٹی کے کلنک میں پریکٹس شروع کرلو۔''
''یہی تو ہم بھی کہہ رہے ہیں۔ انکل آپ کے پاس دو مکان ہیں۔ اس میں سے یہ مکان ہمارے نام کردیجئے تا کہ ہم اس میں اپنا کلینک کھولیں اور ملحق مکان میں رہ سکیں۔ چھوٹی آنٹی اور آپ کے لیے دوسرا مکان کافی ہے۔'' سریتا نے ہمت جٹا کر اپنے من کی بات کہہ ہی ڈالی۔
امرناتھ اچنبھے میں پڑ گیا۔ وہ اپنے کانوں پر یقین ہی نہ کرسکا کہ ایک چھوٹی سے گڑیا جس کو اس نے اپنے ہاتھوں سے کھلایا تھا، جو کل تک اس کی انگلی تھامے سکول جاتی تھی اور توتلی زبان میں چاکلیٹ یا ٹافی مانگتی تھی، اب اتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے۔ اس نے خود کو سنبھال کر جواب دیا۔
''کلینک کھولنے یا مکان میں رہنے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم دوسرے مکان میں شفٹ کرلیں گے۔ حالانکہ وہ مکان ہی اب ہماری آمدنی کا واحد ذریعہ ہے پھر بھی ہم ایک کرایے دار کو نکال دیں گے۔ البتہ مکان کا بیع نامہ یا انتقال ابھی نہیں ہوسکتا۔ مکان ہم تینوں کے نام تھا اور اب دو کا رہ گیا ہے۔ جب تک زندہ رہیں گے ہمارے ہی نام رہے گا۔ اس کے بعد ساری جائیداد آپ لوگوں کی ہی ہوگی۔ آخر ہمارے وارث تو تمہیں ہو۔''
بات تو معقول تھی مگر سریتا کے شوہر کو پسند نہیں آئی۔ اس نے اپنے دل میں نہ جانے کتنے منصوبے بنائے تھے جن پر پانی پھر گیا۔ شاید سریتا ان منصوبوں سے بے خبر تھی۔ وہ کلینک کو زمانۂ حال کے مطابق بنانا چاہتا تھا۔ رہائشی مکان کو ائیر کنڈیشنڈ میٹرنٹی ہوم میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ اس کو خدشہ تھا کہ پانچ دس لاکھ روپیہ خرچ کر کے کل کو کسی وجہ سے اسے بے دخل کیا گیا تو اس سرمایے کا کیا ہوگا؟ اس لیے وہ انکل کو پھر سے باور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔
''انکل بات صرف کلینک کھولنے کی نہیں ہے۔ جب یہ ہمارے نام ہوگا تو ہم اس کو جدید طرز کا بنائیں گے، موڈرن آلات سے لیس کریں گے اور پھر ائیر کنڈیشن بھی کرائیں گے جس کے لیے بہت سرمایے کی ضرورت پڑے گی۔ ہمیں ان کاموں کے لیے بنک سے قرضہ لینا پڑے گا۔ یہ سب کچھ تبھی

ممکن ہوسکتا ہے جب یہ ہمارے نام ہوگا۔''

''داماد جی، کاغذ کی ہی تو بات ہے۔آپ کلینک کو جیسے چاہیں سجائیں، سنواریں اور استعمال کریں۔ مگر ہم دو جب تک زندہ ہیں یہ ہمارے ہی نام رہے گا۔''

جواب دوٹوک تھا۔ ڈاکٹر سریتا اور اس کا شوہر روٹھ کر اسی رات چلے گئے اور پھر کبھی پلٹ کر نہ آئے۔ بڑی آنٹی کا کریا کرم تو خیر امرناتھ نے کیا ہی تھا لیکن سریتا نے باقی فرائض سے بھی اپنا پلا چھڑا لیا۔اس کے بعد وہ اپنے کیے کا جواز لوگوں کو دیتی رہی۔ ہر کسی سے وہ یہی کہتی کہ انکل نے اس کے شوہر کا اپمان کیا اور ہمیں ساری جائیداد سے بے دخل کر دیا۔

قریب دس سال بعد میری پوسٹنگ دہلی ہوئی۔ میں نے ٹیلی فون پر سریتا سے رابطہ کیا اور اس نے کملا آنٹی کے سورگباش ہونے کی بری خبر سنائی جس کا مجھے کوئی علم ہی نہ تھا۔ میں دوڑا بھاگا انکل اور چھوٹی آنٹی سے ملنے ان کے گھر گیا۔کلینک کا دروازہ کسی قلعے کے دروازے کی مانند بند پڑا تھا۔ بہت دیر کھٹکھٹانے کے بعد اندر سے ایک نحیف سی آواز سنائی دی جسے میں فوراً پہچان گیا۔

''کون ہے؟'' انکل نے دروازہ کھولنے سے پہلے سوال کیا۔

''میں ہوں......سریندر۔''

''بیٹے تم......!'' وہ بھی جلدی ہی میری آواز پہچان گیا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا۔

وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ کمر بھی جھک گئی تھی۔ سر پر تھوڑے بہت سفید بال تھے جو آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ نہ تو اس نے کئی دنوں سے شیو بنائی تھی اور نہ ہی نہایا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا۔

''بیٹے، آج کل چور گھروں میں گھس کر بوڑھے لوگوں کو مار دیتے ہیں اور پھر سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم کسی کو دروازہ نہیں کھولتے۔ کلینک کا دروازہ تو برسوں سے کبھی کھولا ہی نہیں۔ صرف کام والی پچھلے دروازے سے اندر آتی ہے اور کوئی نہیں۔ میں نے تو تمہاری آواز پہچان لی، تب دروازہ کھول دیا۔''

اس کے چہرے سے خوف و ہراس صاف جھلک رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ دونوں بوڑھے ڈر ڈر کر اپنی زندگی کے باقی دن گزار رہے تھے۔ پورے گھر پر موت کے سائے حاوی ہو چکے تھے۔ میں جوں جوں اندر داخل ہوتا رہا تیز بدبو میرے نتھنوں کو چبھنے لگی۔ میں نے سارے ماحول کا جائزہ لیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ڈاکٹر کملا دیوی کے مرنے کے بعد اس گھر کی زندگی جمود کا شکار ہو چکی

تھی۔ سب چیزیں جوں کی توں پڑی ہوئی تھیں۔ ان پر برسوں کی گرد جم گئی تھی۔

اتنے میں چھوٹی آنٹی کراہتی ہوئی بیڈروم سے باہر نکل آئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''بیٹے، اتنے سال کہاں رہے۔ کبھی خبر بھی نہ لی۔ آنٹی نہیں رہی تو کیا ہم لوگ نہیں تھے؟''

وہ بیساکھیوں کے سہارے چل رہی تھی۔ جسم تو پہلے ہی سے پھپّس تھا اب گٹھیا روگ نے اس کے گھٹنوں کو ناکارہ کردیا تھا۔ آنکھوں پر بھی موٹا سا چشمہ چڑھ گیا تھا۔ سر پر جو تھوڑے بہت سفید بال رہ چکے تھے انہیں ربر بینڈ سے بند کرلیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

پھر دونوں نے باری باری گزرتے ہوئے برسوں کی روداد سنائی۔ ان کی باتوں کا مرکز پریم اور سریتا تھی۔

''سریتا بیٹی نے توتے کی طرح آنکھیں پھیرلیں۔ بڑی دیدی کے مرنے کے بعد ہی وہ جائیداد کا جھگڑا کھڑا کر کے چلی گئی اور پھر کبھی بھی شکل نہیں دکھائی۔ ہم مرتے ہیں یا جیتے ہیں اس کو کوئی فکر نہیں''۔ انکل نے آنسو بہاتے ہوئے بڑی دل شکستگی کے ساتھ کہا۔ ''خیر ہم تو جیسے تیسے جی لیں گے۔ اس کو بھی بھگوان کے پاس جواب دینا پڑے گا۔ گزری گزران کیا جھونپڑی کیا مکان۔''

پھر آنٹی کی باری آئی۔ وہ بھی روتے روتے کہنے لگی۔

''اب تو میں بھی پریکٹس نہیں کرپاتی۔ پچھلے سال سیڑھی سے گر کر ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ایک مہینہ پلاسٹر چڑھا رہا۔ مگر کیا مجال جو سریتا نے حال بھی پوچھا ہو۔ وہ تو سب کچھ بھول گئی۔ ان ہاتھوں سے اس کو کھلاتی تھی۔ پہروں کھڑی رہتی تھی۔ جن دنوں وہ کالج میں پڑھتی تھی، رات رات بھر اس کے ساتھ جاگتی رہتی تاکہ وہ امتحان میں زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرسکے۔ مگر اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔''

''میڈیکل کالج سے صرف ٹیلی فون کرتی تو میں دوڑا بھاگا پہنچ جاتا کبھی کھیر لے کر، کبھی گاجر کا حلوا لے کر اور کبھی مٹھائیاں لے کر۔'' انکل پھر بول پڑے۔

''اس کی بھی مجبوریاں ہوں گی۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے شوہر کے دباؤ میں آکر یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔'' میں نے تسلی دینے کی کوشش کی اور پھر اجازت لے کر وہاں سے چل دیا۔ راستے میں کئی سوالات میرے ذہن کے پردے پر نمودار ہوگئے۔

کیا اب اس دھرتی پر بوڑھے محفوظ نہیں رہے؟ کیا یہ صورت حال دہلی تک ہی محدود ہے یا پھر ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی پائی جاتی ہے؟ کیا دولت کو پوجنے والے خون کے رشتوں کو اسی طرح

بھول جاتے ہیں؟ کیا ڈاکٹر سریتا صرف اپنے شوہر کے دباؤ میں آ کر یہ سب کچھ کر رہی ہے یا پھر وہ خود بھی اس گناہ میں ملوث ہے؟

مجھے کسی بھی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ البتہ میرے خون کا دباؤ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور میں گھر جانے کے بجائے سیدھے سریتا کے کلینک پر پہنچ گیا۔

''ہیلو سریندر، کیسے ہو؟'' سریتا مجھ کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

''بھگوان کی دَیا سے اچھا ہوں...... آج تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔'' میں نے وقت ضائع کرنے کے بغیر ہی اپنا مدعا بیان کرنا مناسب سمجھ لیا۔ ''سریتا میں انکل اور آنٹی سے مل کر سیدھا یہاں چلا آیا۔ ان کی حالتِ زار دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ لوگ کس کسمپرسی کی حالت میں اپنی آخری سانسیں گن رہے ہیں۔ سریتا......! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ کیا وہ تمہارے انکل اور انٹی نہیں ہیں؟ کیا تمہارا ان کے تئیں کوئی فرض نہیں بنتا۔ اس مکان میں جہاں مجھے کبھی زندگی کے اجالے نظر آتے تھے وہاں آج اندھیرے ہی اندھیرے ہیں۔ ہر ذرّے سے بدبو اور سڑاند آ رہی ہے۔''

سریتا نے اپنی صفائی پیش کی مگر میں متاثر نہ ہو سکا۔ اس لیے گویا ہوا۔

''یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ہی غلطی کی ہو۔ حالاں کہ میری نظروں میں انکل نے جو کچھ بھی کیا وہ وقت کا تقاضہ تھا۔ جس کو زندگی میں آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہو وہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ اگر میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو شاید یہی کر لیتا۔ مگر تم تو سمجھدار تھی۔ انہوں نے تمہیں پالا پوسا تھا۔ کیا وہ یہی توقع تم سے رکھتے ہیں؟''

''انہوں نے پریم کو ناراض کر دیا۔ وہ تو اس گھر میں جانا ہی نہیں چاہتا۔ پریم کو تو ان کے نام ہی سے چڑ ہو گئی ہے۔''

''مانا پریم وہاں نہیں جانا چاہتا ہے، تم تو جا سکتی ہو، وہ تمہارے رشتے دار ہیں، پریم کے نہیں۔ انہیں تم سے امیدیں ہیں پریم سے نہیں۔ تم ڈاکٹر ہو، اچھا خاصہ کماتی ہو۔ خود مختار ہو۔ اپنے رشتے داروں سے میل جول رکھنے کے لیے وہ تمہیں چھوڑ نہیں سکتا اور اگر خدانخواستہ چھوڑ بھی دے تو کیا ہوتا ہے۔ جیسے وہ اپنے ماں باپ کی دیکھ بھال کرنے کا حق رکھتا ہے ویسے ہی تمہیں بھی یہ حق حاصل ہے۔''

''پھر میں کیا کروں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''کم سے کم اتنا تو کر سکتی ہو کہ ہر اتوار کو وہاں جا کر مکان کی صفائی کروا لو۔ انکل آنٹی کے کپڑے

وفا کی خوشبو

میں ایک بہت بڑے کینواس کے سامنے کھڑا ہوں اور نہیں جانتا کہ دس منٹ پہلے میں نے جو شیخی بگھاری تھی اس کی کاربندی کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ شیام لال، جو اکادمی کے سیوائے کیمپس آفس میں ہیڈ کلرک ہے اور جس نے ڈائریکٹر کی بیوی کے سامنے میری مصوری کی تعریف کر کے مجھے اس مصیبت میں پھنسا دیا ہے، میرے سامنے ڈسٹمپر رنگوں کے دو چار ڈبے اور کوچیاں رکھ کر چلا گیا ہے۔ نو دس آئی اے ایس پروبیشنر، جو گذشتہ دو روز سے طالب علمی کے دوران استعمال ہونے والے چھوٹے چھوٹے موقلموں سے اس جہازی کینواس کا پیٹ مختلف رنگوں سے بھرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، اس کام کو چھوڑ کر یکے بعد دیگرے جا چکے ہیں۔ جاتے جاتے انہوں نے مڑ کر مجھے رحم بھری نگاہوں سے دیکھ لیا جیسے کہہ رہے ہوں۔

"لگے رہو بچو، اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو ڈینگ مارنے کا انجام! کر لو پینٹ اتنی بڑی تصویر۔ کبھی ہاتھ میں برش تھاما بھی ہے یا نہیں؟"

میں بھی اسی تذبذب میں خاموش کھڑا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میں نے یہ مصیبت کیوں مول لی۔ کیا ضرورت تھی اکادمی کے ڈائریکٹر کی بیوی کے سامنے یہ جتانے کی کہ ان موقلموں اور آئیل پینٹس سے اتنے کم وقت میں اسٹیج کا پس منظر نہیں بن سکتا۔ وہ تو کام کی سست رفتاری دیکھ کر پہلے ہی سے

پریشاں تھی۔ اسی لیے مسز سکسینہ نے طوق میرے گلے میں ڈال دی۔ اب تو وہی بات ہوگئی۔ سانپ کے منہ میں چھچھوندر، نگلے تو اندھا، اگلے تو کوڑھی۔

دو روز کے بعد جنم اشٹمی ہے۔ معروف بھارتیہ ناٹیم ڈانسر شوبھنا نرائین کو، جو انڈین ریونیو سروس کی پروبیشنر بھی ہے، ٹوکری میں نومولود کرشن کنہیا اٹھا کر طغیانی پر آئی ہوئی جمنا پار کرنی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس ڈانس ڈرامہ میں ڈائریکٹر کی صاحبزادی رادھا کا رول نبھا رہی ہے۔ اس لیے اکادمی کا سارا سٹاف مستعد ہے۔

میرے اندر جمنا میں آئی باڑھ سے بھی زیادہ طوفان اٹھ رہا ہے جسے میں اکیلے جھیل رہا ہوں۔ ذہن مفلوج ہو رہا ہے۔ شریانوں میں خون منجمد ہو رہا ہے۔ چارلِول کیمپس کے لیڈیز بلاک کے برآمدہ میں، جہاں یہ جہازی کینوا اس دیوار کے سہارے ٹکا ہوا ہے، مجھے خوف زدہ کر رہا ہے۔ میں ڈسٹمپر رنگوں کے پیکٹ کھولنے سے ڈرتا ہوں۔ کہیں بعد میں منہ کی نہ کھانی پڑے۔ میں نے بھی سکول میں چھوٹے چھوٹے موقلم استعمال کیے ہیں مگر کبھی کوچی سے ڈسٹمپر پوتنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ دو چار ڈراموں میں چند کرداروں کا رول نبھایا ہے۔ وہیں کانوں میں بھنک پڑی تھی کہ اسٹیج کا پس منظر پینٹ کرنے کے لیے ڈسٹمپر استعمال کیا جاتا ہے۔

خیر ہمت جٹا کر میں نے پیکٹ کھول کر رنگ پانی میں گھول دیے۔ نیلا رنگ بہت ہی ہلکا نظر آرہا ہے۔ دریا کی موجوں کو ابھارنے کے لیے مجھے گہرے نیلے رنگ کی ضرورت ہے۔ میرے خون کا دباؤ بدستور بڑھتا جا رہا ہے۔ میری ساکھ داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ میں نے غلام گردش میں رکھے ہوئے ٹیلیفون پر شیام لال سے بات کی۔

''شیام لال جی، آپ نے تو بہت ہی ہلکا نیلا رنگ لایا ہے۔ مجھے تو گہرے نیلے رنگ کی ضرورت ہے۔''

''سر، میں نے سارا بازار چھان مارا۔ گہرا نیلا رنگ کہیں نہیں ملا۔ دکان داروں کا کہنا ہے کہ ڈسٹمپر رنگوں میں گہرا نیلا رنگ نہیں ہوتا۔''

میں نے دل ہی دل میں اس کو گالی دی۔

''سالا، حرامی ...... اپنی نوکری بنانے کے لیے مجھے پھنسا دیا۔''

پھر اچانک میرے دماغ میں بجلی سی چمک اٹھی۔ میں دوبارہ اسے مخاطب ہوا۔

''شیام لال جی، اگر گہرا نیلا ڈسٹمپر نہیں ملتا، رابن بلیو نیل کے دو چار پیکٹ تو مل سکتے ہیں۔ وہی

نیل جسے کپڑے اجالتے ہیں۔ چار بڑے ڈبے لا کر دیجیے۔ میں کام چلالوں گا۔''

میں اپنی اس حماقت پر ہنس رہا ہوں۔ نیل تو سوکھ کر کپڑوں کو اُجالتی ہے۔ بگلے کی مانند سفید بنا دیتی ہے۔ پھر اس سے گہری شیڈ لانا کیسے ممکن ہوگا؟ اگر کینواس سوکھ کر سفید ہو گیا تو......؟

''چھوڑو۔ جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ مجھے کوشش تو کرنی چاہیے۔'' میں اپنے دل کو دلاسہ دیتا ہوا نیل کا انتظار کر رہا ہوں۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ درجہ حرارت لگاتار کم ہوتا جا رہا ہے۔ میرے بدن کی حرارت بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ میں کینواس کے سامنے سفید ٹی شرٹ اور نکرّ میں ٹھٹھر رہا ہوں۔

شیام لال نے نیل کے چار ڈبےّ میرے سامنے لا کر رکھ دیے۔ میں نے دو تین روم ہیٹر بھی منگوائے اور انہیں کینواس کے پیچھے ایسے رکھوا دیا کہ ان کی آنچ سے کینواس ساتھ ساتھ ہی سوکھتا بھی رہے۔

رنگ تیار ہوئے۔ اب کام کرنے کی دیر ہے۔ لیکن کام کروں تو کیسے؟ میرے من میں کئی سوال اٹھ رہے ہیں جن کا جواب میں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرا وجود ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔

اتنے میں بغل والے کمرے سے ایک سانولی سلونی لڑکی برآمد ہوئی ہے۔

''ہائے'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''ہائے'' میں نے بھی جواب دینا مناسب سمجھا۔

''باقی سب لوگ کہاں چلے گئے؟''

''وہ تو چلے گئے۔ انہیں میرا مشورہ پسند نہیں آیا۔ شاید اُن کی اَنا کو چوٹ لگ گئی۔''

''ہاں۔ ان آئی اے ایس افسروں کی یہی تو بری عادت ہے۔ اپنے سے بڑا کسی کو مانتے ہی نہیں۔ ہر میدان میں خود کو ایکسپرٹ سمجھتے ہیں۔ اونچ نیچ تو ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ ہم الائیڈ سروسز والوں کو کم درجے کا گردانتے ہیں۔''

''آپ کا نام......؟''

''میں......اُروشی آئینگر......انکم ٹیکس سروس کی پروبیشنر۔''

''اور میں سدرشن بھان......انڈین پوسٹل سروس پروبیشنر''

''اوہ آئی سی، تم نے تو ابھی تک کچھ بھی پینٹ نہیں کیا ہے۔''

''کرلوں گا۔ ابھی تک سامان وغیرہ منگوا رہا تھا۔ یہاں سردی بہت لگ رہی ہے۔ معلوم ہوتا تو سوئیٹر پہن کر آ جاتا۔ ان کپڑوں میں کچھ زیادہ ہی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' میں نے اپنے وسوسوں اور

اندیشوں کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تم تھوڑا انتظار کرلو۔ میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔" وہ اپنے کمرے میں جا کر سوئیٹر ہاتھ میں اٹھائے لوٹ آئی۔ "اسے پہن لو۔ تھوڑی بہت گرمی محسوس ہوگی۔" پھر وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔ کچھ وقفے کے بعد وہ گرم گرم پکوڑے اور کافی کے دمگ لیے باہر آئی اور میرے روبرو بیٹھ گئی۔

جتنی دیر وہ میرے سامنے بیٹھی رہی، میں اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیتا رہا۔ سانولا رنگ، تیکھے ناک نقشے، کولھوں تک سیاہ بالوں کی لٹیں اور آنکھوں میں مستی کے پیالے بھرے ہوئے۔ اس کے بدن سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے بدن کی مخصوص شہوت انگیز سگند میرے وجود کا احاطہ کرر ہی تھی۔ ہم دونوں آرٹ اور پینٹنگ کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ میرے جسم میں نیا جوش، نیا ولولہ پیدا ہونے لگا جو مجھے کچھ کارنمایاں کرنے کے لیے اُکسا رہا تھا۔ کافی کے خالی مگ اور پلیٹ اٹھا کر میں نے اس کے کمرے میں رکھ دیے۔ یکایک وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور میرے ساتھ ایسے لپٹ گئی جیسے کوئی ناگن چندن کے پیڑ سے لپٹ رہی ہو۔ پھر ایک بھرپور بوسے نے میرے لبوں میں جان ڈال دی اور میں شتابی کمرے سے باہر نکل آیا۔

اب میں ہوں اور میرا کینواس۔ میرے ہاتھوں میں کوچی کیسے آگئی اور وہ کوچی کیسے اندھا دھند چلنے لگی مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں دیوانوں کی طرح کینواس پر رنگ پوت رہا ہوں۔ پہلے ہلکے اور ان کے سوکھ جانے کے بعد گہرے۔ کینواس پر اجالے اور تاریکیاں ایک دوسرے کو ابھارنے میں مدد دے رہے ہیں۔ رابن بلیو نے اپنا کام کر دیا۔ اس سے بھی زیادہ کام کر گیا اُروشی کا وہ لمبا شیریں اور حرارت انگیز بوسہ، اس کے بدن کا لمس اور اس کی زُلفوں کی وہ خوشبو جو میری روح کے اندر سما گئی۔ وہ خوشبو اب بھی میرے بدن کے ساتھ سوئیٹر کے توسل سے لپٹی ہوئی ہے اور میں رُکے بغیر کینواس میں رنگ بھرے جا رہا ہوں۔

مجھے آج پہلی بار محسوس ہو رہا ہے کہ عورت کے چند توصیفی کلمات مرد کی حسِ ظفریابی کو اوج تک پہنچا سکتے ہیں۔ اب نہ مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے اور نہ ہی تھکن۔ رنگ عشاق کی طرح ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں۔ چار گھنٹوں ہی میں میری پینٹنگ مکمل ہو چکی ہے۔ وہ پروبیشنر جو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پینٹنگ کو دیکھنے کے لیے ایک ایک کر کے واپس چلے آرہے ہیں اور من ہی من میں مجھ پر رشک کر رہے ہیں۔

میں نے ہاتھ منہ دھونے کی خاطر اُروشی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا جیسے میرا ہی انتظار کر رہی ہو۔ میں نے اس کا باتھ روم استعمال کرنے کی اجازت مانگی اور پھر اندر جا کر ہاتھ منہ صاف کرنے لگا۔ باہر اُروشی میرے لیے گرم گرم کافی اور نمکین لے کر انتظار کر رہی ہے۔ہم دونوں کافی پی کر محظوظ ہو رہے ہیں۔اس کو میری فتح یابی پر مجھ سے زیادہ خوشی ہو رہی ہے۔ اپنے کیمپس تک پہنچنے میں مجھے ابھی چار پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا ہے۔اروشی نے مجھے دوبارہ گلے لگا کر اور بوسہ دے کر ریچارج کر لیا ہے۔

میں نے شیام لال کو پینٹنگ سونپ کر سیوائے کیمپس کا رخ کر لیا۔میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور میں اکیلا بالکل اکیلا بارش سے دھلی ہوئی مصوری کی سڑک پر چلا جا رہا ہوں۔گو میں نے اروشی کو سوئیٹر لوٹا دی ہے تاہم اُس کے بدن کی مہک ابھی بھی میرے ساتھ ہے۔ میں بے نیازی اور سرشاری کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا ہوں۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ درمیانی دو راتیں کیسے گزر گئیں۔

اب میں چارل وِل کے آڈیٹوریم میں بیٹھا ڈانس ڈرامہ دیکھ رہا ہوں۔اسٹیج کے پس منظر میں میری پینٹنگ ایسے لگ رہی ہے جیسے صدیوں سے وہ اسی اسٹیج کی زینت بن چکی ہو۔

شوبھنا نرائین واسدیو کا روپ دھارن کر کے سر پر ٹوکری میں بھگوان کرشن کو اٹھائے چڑھاؤ پر آئی ہوئی جمنا پار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔جمنا کی متلاطم موجیں اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی جا رہی ہیں اور کرشن کے پاؤں کو چھونے کی کوشش کر رہی ہیں۔آسماں پر کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جونہی واسدیو کرشن کو جمنا پار کرائیں گے تو آسمان پر بجلیاں کوندیں گی اور سارے بادل ایک دم پھٹ پڑیں گے۔اور یہ سب پس منظر میں لگی ہوئی پینٹنگ کا نتیجہ ہے جس نے اس طغیانی کے منظر کو منعکس کیا ہے۔ناظرین پر وجد سا طاری ہو رہا ہے اور سبھی لوگ تجسس کے باعث اپنی اپنی سیٹوں پر ایسے بیٹھے ہیں گویا کانٹوں پر بیٹھے ہوئے ہوں۔ کچھ توقع بھری امید سی ہے اور کچھ نرتیہ کا طلسم چھا رہا ہے۔

مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ پس منظر کی پینٹنگ میری بنائی ہوئی ہے۔ میں نے تو اس سے پہلے کبھی اسٹیج کے بیک گراؤنڈ پینٹ نہیں کیے ہیں۔ حالاں کہ میں نے پینٹنگ پر جلی حروف میں اپنا نام تحریر کیا ہے لیکن کوئی بھی شخص اس طرف دھیان نہیں دے رہا ہے۔ وہ سب شوبھنا نرائین کے نرتیہ پر جھوم رہے ہیں۔ کسی کو اس بات کا علم بھی نہیں کہ جو آدمی ان کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، اس خوبصورت پینٹنگ

کا خالق ہے۔

اس واقعے کو گزرے بیس برس ہو چکے ہیں۔ میں آفس کے کام سے کل رات ممبئی پہنچ گیا ہوں۔ یہاں پر قدم رکھتے ہی میں نے اپنے روم میٹ وجے جھن جھن والا کا ٹیلیفون ملایا اور اس سے دوست احباب کی خبر پوچھ رہا ہوں۔ اور پھر مجھے اُروشی یاد آ رہی ہے۔

''وجے، تمہاری سروس میں وہ اروشی آئینگر تھی نا، وہ آج کل کہاں ہے؟''

''تمہیں اس کی یاد کیونکر آئی۔ سدرشن، تم نے اس کے بارے میں کبھی کچھ بھی نہیں سنا؟''

''نہیں تو......''

''یار وہ تو بالکل پاگل سی جذباتی لڑکی تھی۔ پورے ڈیپارٹمنٹ کے لیے ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ جہاں جاتی، اپنے افسروں سے لڑ بیٹھتی۔ سنا ہے کچھ افسروں نے اسے عجیب و غریب مانگیں کی تھیں اور اسی وجہ اُس کی کانفڈینشل رپورٹ بھی خراب کی تھی۔ بیچاری کو کئی برس سے پرموشن نہیں مل رہی تھی۔ دو سال پہلے اس نے اپنے ہی کوارٹر میں سیلنگ فین سے لٹک کر خودکشی کر لی۔''

وجے کی بات سن کر میں سکتے میں آ گیا اور آگے کچھ بول بھی نہیں پایا۔ اس نے مزید کیا کچھ کہا میں سن نہیں پایا۔ بس ''ہوں ہاں'' کر کے میں نے ٹیلیفون نیچے رکھ دیا۔

''وہ لڑکی تھی بھی عجیب سی۔ وہ لمحہ لمحہ جینے کی عادی تھی۔ کبھی دور کی سوچتی بھی نہ تھی۔ شاید کسی لمحے کی جکڑ میں آ کر اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا ہوگا۔'' میرے اندر سے آواز آئی اور ایک بار پھر اس کے جسم کی بُو نے میرا احاطہ کر لیا۔ میں، مغموم اور فکرمند اس بُو میں ڈوبنے کی کوشش کر رہا ہوں۔



لمحوں نے خطا کی ہے......!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں آرمی پوسٹل سروسز سینٹر کامٹی میں تربیت پا رہا تھا۔ میرے ساتھ اور بھی دو افسر ٹریننگ لے رہے تھے۔ ان کے علاوہ میس میں ایک ریکارڈ آفسر بھی قیام پذیر تھا۔ ڈنر سے پہلے چاروں افسر میس میں جمع ہو جاتے، ایک دو پیگ چڑھا لیتے، اور مختلف موضوعات پر خیالات کا تبادلہ کرتے۔

میس میں ایک ریکارڈ پلیئر بھی تھا جس پر میں بیگم اختر کی غزلیں سنا کرتا اور بارہا اپنے ساتھیوں کو غزلوں کے معنی سمجھا دیتا۔ وہ غزلوں کی لفظیات سے اتنے متاثر ہو گئے کہ میری غیر حاضری میں بھی غزلیں سننے لگے۔ ریکارڈ افسر کیپٹن رائے، چنانچہ ریگولر آرمی سے تعلق رکھتا تھا، ہمیں وقتاً فوقتاً فوجی ڈسپلن کے بارے میں سمجھاتا رہتا۔ شاید میری کمزوریوں کو بھانپ کر ایک روز اس نے مجھے یوں نصیحت کی۔

''کیپٹن کلدیپ، فوج میں گاہے بہ گاہے پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کئی فوجی افسروں کی بیویاں شراب پینا پسند کرتی ہیں اور ڈانس میں بھی شریک ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی بھی افسر اپنے ہوش وحواس نہیں کھوتا اور کسی بھی عورت سے بدسلوکی نہیں کرتا۔ میری یہ بات گرہ باندھ کر رکھ لینا کہ کبھی کسی افسر کی بیوی سے عشق لڑانے کی کوشش نہیں کرنا۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

ادھر ہمارے ٹریننگ سینٹر کے کمانڈنٹ اس بات پر مصر تھے کہ ہمیں سینٹر کی پارٹیوں میں آئے مہمان

افسروں اوران کی بیویوں کا گرمجوشی سے استقبال کرنا چاہیے اور جب تک پارٹی اختتام پذیر نہ ہو، ان کی دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ میں میزبانی کے فرائض انجام دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھنا چاہتا تھا پھر بھی حسین عورتوں کے ساتھ رسمی گفتگو سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔

ٹریننگ شروع ہونے کے بیس پچیس دن بعد میں، کیپٹن راجن اور کیپٹن نرسمہن مقامی کانونٹ سکول میں منعقد میلے کو دیکھنے چلے گئے۔ اسٹالوں پر طلبہ کے بنائے ہوئے مٹی کے کھلونے، گڑے گڑیا، کڑھائی کیے ہوئے بیڈ کور، میز پوش، رومال اور خوبصورت پینٹنگز سجی ہوئی تھیں۔ میں پینٹنگز کے اسٹال پر تصویریں دیکھنے میں مشغول ہو گیا کہ اتنی دیر میں پاس ہی ایک نازک سی عورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے خریدنے کے لیے دو تصویریں الگ رکھی تھیں جن کے بارے میں وہ بے خبر تھی۔ اس نے ان ہی میں سے ایک تصویر اٹھالی اور سیلز گرل سے اس کی قیمت پوچھ لی۔

''میڈیم، یہ پینٹنگ صاحب نے الگ رکھی ہے۔ آپ کوئی اور پینٹنگ ڈھونڈ لیجیے۔'' سیلز گرل نے جواب دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ گندمی رنگ کی ایک دبلی پتلی خوبصورت عورت میری بغل میں کھڑی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں میرے دل نے کہا۔ ''ارے کوئی بات نہیں، یہ تصویر کیا چیز ہے، جان بھی مانگ لے تو حاضر کر دوں۔'' میں اسے بالراست مخاطب ہوا۔

''نیور مائنڈ، اگر آپ کو یہ تصویر پسند ہے تو رکھ لیجیے، میں دوسری کوئی تصویر خرید لوں گا۔'' پہلے وہ نہیں مانی لیکن میری ضد کے آگے مجبور ہو گئی۔ اس کے بعد ہم دونوں محو گفتگو ہو گئے۔ اس کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس نے چینئی کے پریذیڈنسی کالج سے فائین آرٹس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے میجر سوامی ناتھن سے شادی کر لی ہے۔

شادی کے بعد وہ بالکل نئے اور اجنبی ماحول میں قید ہو گئی۔ گھر پیتل کے چمکتے ہوئے مصنوعات، مومینٹوز اور جنگی محرکات پر مبنی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک کونے میں وائین کیبنٹ تھا جس کے ساتھ ہی الماری میں مختلف ڈیزائنوں کے گلاس سجے ہوئے تھے۔ گھر کی سجاوٹ دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہاں فوجی افسر رہتا ہے۔ وہ گھنٹوں اس نئے گھر کو دیکھتی رہتی اور سوچتی کہ اس ماحول میں وہ کہاں پرفٹ ہو سکتی ہے۔ اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی پینٹنگز کی کہاں نمائش کرے۔ بے دلی سے اس نے ساری پینٹنگز کو ایک کے اوپر ایک رکھ کر اسٹور روم میں رکھوا دیا۔ تاہم ڈرائنگ روم میں چند

جگہیں ابھی بھی خالی نظر آرہی تھیں۔ بس وہاں پر دو ایک تصویروں کو قرینے سے لٹکا دیا۔ مزید برآں ڈرائنگ روم کے شیلف پر چند اہم مصوروں کی باتصویر کتابیں نمایاں طور پر سجادیں۔ اس معمولی ردوبدل کے خلاف میجر سوامی ناتھن نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

میلے سے رخصت ہوتے وقت پدمنی نے مجھے اپنا ایڈریس دیا اور گھر آنے کے دعوت دی۔ میں نے راجن اور نرسمہن سے مشورہ کیا مگر دونوں نے مجھے ایسا کرنے سے روک لیا۔ پھر مجھے کیپٹن رائے کی نصیحت یاد آئی، اس لیے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ رات ڈنر کے وقت کیپٹن رائے سے بھی اس بارے میں بات ہوئی۔ اس نے ہدایت دی کہ ''تم وہاں کیسے جاسکتے ہو۔ میجر سوامی ناتھن کو تو جانتے نہیں ہو۔ نہ ہی اس کے ساتھ کوئی آفیشل رشتہ ہے۔ پھر اس کے ہاں کال آن کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ کسی کی بیوی سے ملنے اس کے گھر تھوڑے ہی جاتے ہیں۔!''

بات معقول تھی۔ سو میں نے اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ پھر ایک روز پوسٹل ٹریننگ سینٹر میں ڈنر پارٹی کا اہتمام ہوا۔ میجر سوامی ناتھن بھی مدعو تھے۔ مسز سوامی ناتھن کی نظر جونہی مجھ پر پڑی وہ ایسے کھنچی چلی آئی جیسے کوئی تنکا کہربا کی طرف چلا آتا ہے۔ بہت دیر باتیں ہوتی رہیں۔ کوشش کرنے کے باوجود میں خود کو اس کے چنگل سے چھڑا نہ پایا مگر یہ بھی سچ ہے کہ دل اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مصوری کے بارے میں اس کی تبحر علمی نے مجھے اس کا قائل کر دیا۔ اس نے روائتی پینٹرز لیونا رڈو ڈاونچی، مائیکل انجیلو اور ریمبرانٹ پر اپنے خیالات کا اظہار اسی آسانی سے کیا جس طرح وہ موڈرن پینٹرز سیزان، پکاسو اور واں گوگھ پر کرنے لگی۔ اس نے زماں ومکاں کی حدبندیوں اور ان سے چھٹکارا پانے کی جدیدیت پسند مصوروں کی کوششوں پر بھی روشنی ڈالی۔ میں پدمنی کو غور سے سنتا رہا اور نہ صرف محظوظ ہوتا رہا بلکہ اپنے علم میں بھی اضافہ کرتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد میجر سوامی ناتھن ہاتھ میں وہسکی کا گلاس لیے ہمارے قریب آیا۔ پدمنی نے میرا تعارف کرانے کی کوشش کی لیکن اس نے نظر انداز کر کے پدمنی کو اپنے اعلیٰ افسروں سے ملوانے کے لیے تحکمانہ انداز میں آرڈر دیا اور وہ لومڑی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔

کیپٹن رائے نے دور سے میری جانب یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''بھئی بھول جاو اسے، وہ چلی گئی اور اب نہیں آئے گی۔ وہاں جانا بھی مت۔ تہذیب کے خلاف ہے۔''

پارٹی اختتام کو پہنچی۔ رخصت ہوتے وقت پدمنی اپنے شوہر کے ساتھ میرے پاس سے گزری اور اس

نے اپنی دعوت پھر دہرائی۔ ''یو مسٹ کم سَم ٹائم ٹو اور ہوم۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' پھر میجر سوامی ناتھن کی طرف مخاطب ہوئی۔ ''ہی از اے ویری گڈ پینٹر۔ اس کو آرٹ کی بہت اچھی پہچان ہے۔''

میں نے اس کی دعوت کو نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ ہوسکتا ہے اس وقت میجر صاحب شراب کے نشے میں دھت ہو اور اسے اب یاد بھی نہ ہو کہ اس کی بیوی نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی ہے۔ ان کے گھر جانے کا اور کوئی جواز بھی تو نہیں بنتا تھا۔ بہر حال دعوت کو مسترد کرنے کے باوجود تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ ایک روز میں اور راجن پدمنی کے گھر کے نزدیک مارکیٹ میں خریداری کر رہے تھے کہ وہاں پر دونوں میاں بیوی کا سامنا ہوا۔ پدمنی کی نظر جونہی مجھ پر پڑی، اسے رہا نہ گیا۔ وہیں سے مجھے پکارنے لگی۔

''ہیلو کیپٹن کلدیپ، کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔ پریکٹیکلی فائین۔'' میں نے قدرے نزدیک جاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ ہمارے گھر آئے ہی نہیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ آج تو میں نہیں چھوڑوں گی۔ میرا گھر بالکل سامنے ہے۔ یو ہیو ٹو کم ٹوڈے۔'' اس کے لہجے میں حکم بھی تھا اور التجا بھی۔

میں انکار نہ کرسکا۔ میں اور راجن دونوں ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ چونکہ راجن کو مصوری کے ساتھ کوئی رغبت نہیں تھی اس لیے وہ سوامی ناتھن کے ساتھ گفتگو میں محو ہوگیا۔ وہ دونوں ایک ہی ریاست سے تعلق رکھتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے، اس لیے باہمی دلچسپی کے موضوعات ڈھونڈنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ البتہ میں اور پدمنی ڈرائنگ روم میں ان سے کچھ فاصلے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ پدمنی نے پھرتی سے جاکر سٹور روم سے چنندہ پینٹنگز نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ بالکل پروفیشنل پینٹنگز تھیں۔ میں ان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ دل میں عجیب سی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

کچھ وقفے کے بعد پدمنی کیپٹن راجن سے پوچھنے لگی۔ ''آپ کیا لیں گے، کوفی یا چائے۔''

''چائے چلے گی۔''

''ہنی، وہاٹ اباوٹ یو......؟''

''آئی وِل ہیوٹی۔''

اس کے بعد وہ میرے قریب آئی اور دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

''کیپٹن کلدیپ۔ میں اور تم کوفی پییں گے۔ ٹھیک ہے!''

اس نے میرے لیے دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا۔ اس لیے انکار کرنا پاگل پن تھا۔ خیر مجھے کوفی پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ دریں اثنا پدمنی کچن میں جا کر بیٹ مین کو ہدایت دینے لگی اور میں اپنی نشست سے کھڑا ہو کر الماری میں سجی ہوئی مصوری کی کتابیں الٹتا پلٹتا رہا۔ جب تک وہ باہر نکل آئی میرے ذہن میں سوچوں کا ایک طوفان کروٹیں لیتا رہا۔ ''دنیا میں کیسے کیسے ٹیلنٹ روایتی بندھندوں میں بندھ کر ضائع ہو جاتے ہیں! اس عورت کو کسی آرٹ کالج میں پروفیسر ہونا چاہیے تھا یا پھر فری لانس آرٹسٹ! کتنا اچھا نام کمایا ہوتا اب تک...... ! مگر بے چاری کہاں پھنس گئی ہے۔ میاں بیوی کی سوچ کے درمیان قطبین کا فاصلہ ہے۔ کیا انہوں نے آپس میں کبھی آرٹ اور پینٹنگ کے بارے میں گفتگو کی ہوگی؟ کیا میجر سوامی ناتھن نے کبھی اپنی بیوی کے ٹیلنٹ کو سمجھنے اور نکھارنے کی کوشش کی ہوگی؟'' ایسے ہی سوالات ہتھوڑے بن کر میرے دماغ پر مسلسل برس رہے تھے حالانکہ مجھے بخوبی یہ احساس تھا کہ فوجی افسر کے لیے یہ سب کچھ کرنا ناممکن ہے۔ اس کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے۔ آرٹ کے لیے جس تپسیا اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے وہ لیفٹ رائٹ کی گونج میں پنپ نہیں سکتی۔

پدمنی کوفی کے دو کپ لے کر میرے روبرو بیٹھ گئی۔ اس کی خوبصورتی نہ صرف میری ذہنی تاریکیوں کو اجالتی رہی بلکہ اس کی میٹھی اور شیریں آواز میرے کانوں میں رس گھولتی رہی۔ ادھر بیٹ مین چائے اور ناشتہ لے کر میجر سوامی ناتھن کے سامنے کھڑا ہو گیا جب تک ان دونوں نے اپنے اپنے کپ اٹھا لیے اور ناشتے کے پلیٹ اپنے سامنے میز پر رکھ دی۔

کوفی کی چسکیاں لیتے ہوئے پدمنی نے ایک بھرپور انگڑائی لی جو اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ اپنی معمول کی زندگی سے تنگ آ چکی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قید سے کیسے آزاد ہو سکتی ہے۔ پوری زندگی میں کبھی آزاد ہو گی بھی یا نہیں، اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہر حال میں نے اس کو بار بار یہ بات ذہن نشین کرائی کہ وہ اپنی صلاحیت کو ضائع کر رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ اسے خلوص کے ساتھ لگاتار کام کرنا چاہیے۔

کوفی ختم ہوئی۔ ہم نے میز بانوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر رخصت ہو گئے۔

اس ملاقات کے بعد تقریباً دس سال بیت گئے۔ ایک روز میں دہلی موڈرن آرٹ گیلری میں تصویروں کی نمائش دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے دو تصویریں جانی پہچانی معلوم ہو رہی تھیں۔ شاید میں نے پہلے کبھی دیکھی تھیں۔ میں نے تصویروں پر لکھے ہوئے دستخط کو پڑھنے کی کوشش کی۔ لکھا تھا۔ ''پدمنی'' میں

نے پاس ہی کھڑے گیلری کے ملازم سے پوچھا۔

''سنیئے۔ یہ پدمنی جی یہاں پر موجود ہیں کیا؟''

''ہاں وہ اندر کیبن میں بیٹھی ہوئی ہیں۔''

میں اسے ملنے اندر چلا گیا۔ وہ سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ بالوں پر کہیں کہیں سفیدی چھا گئی تھی جس کے سبب اس کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی ابھر آئی تھی۔ ڈھیلے کُرتے اور جینز میں ملبوس اس نے گلے میں دو چار مالائیں پہن رکھی تھیں جن میں ایک رُدراکش کی مالا بھی تھی۔ انگلیوں میں طرح طرح کی انگوٹھیاں پہنی تھیں البتہ چہرے پر اب بھی وہی چمک دمک نظر آرہی تھی۔

آپس میں خوب باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا کہ ہماری پچھلی ملاقات کے بعد اس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آیا۔ وہ اپنے بارے میں، اپنی زندگی کے بارے میں اور اپنی صلاحیتوں کے بارے میں دن رات سوچنے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ کھانا پینا، سونا اور بچے پیدا کرنا ہی انسانی زندگی کا منصب نہیں ہے۔ اس لیے وہ ایک روز گھر چھوڑ کر واپس اپنے میکے چلی گئی اور پھر سے اپنے ہاتھ میں سنجیدگی کے ساتھ برش اٹھالیا۔ اس کا یہ قدم میجر سوامی ناتھن کو ناگوار گزرا اور لفٹ رائٹ کرنے والے اس فوجی افسر نے حکم دیا۔ ''تھم...... جیسے تھے......!'' اور پھر دونوں نے دوبارہ شادی سے پہلے والی صورت اپنالی۔

پدمنی ایک بار پھر اپنے گرو کے شرن میں چلی گئی اور تن من دھن سے آرٹ کی ہو کر رہ گئی۔ اس کی تصویروں کی نمائش کئی بار ہوئی۔ دو سال کے بعد اس نے فائین آرٹس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کرلی۔

گفتگو کے دوران اس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی کوفی منگوائی اور پھر مخاطب ہوئی۔

''یونو...... آج مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے زندگی میں کچھ حاصل کرلیا ہے ورنہ میں ریوڑ کے ساتھ ساتھ بے سمت چلی جارہی تھی۔ تمہیں یہ خوش خبر بھی دوں کہ پچھلے سال میں نے اپنے گورو جی کے ساتھ شادی کرلی۔'' میں اس کے گلابی چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا۔ آج اس چہرے پر کتنا اطمینان اور سکون نظر آرہا تھا۔

''نئی زندگی مبارک ہو۔ یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ میں تم سے دوبارہ مل سکا۔ ورنہ اس سو کروڑ کی آبادی میں کون کہاں پھر مل پاتا ہے۔ خیر اب میں اجازت چاہوں گا۔'' میں نے پدمنی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر تردد میں ڈوبا ہوا گیلری سے باہر نکل آیا۔



لذتِ خلوت

اس کے ساتھ دوستی کر کے مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میں اس کی گاڑی کی سٹیپنی بن چکا ہوں۔ جب ضرورت پڑی گاڑی میں فِٹ کر لی اور نہ الگ کر کے لٹکا دی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ میں آج تک اس کی نفسیات کے بارے میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا۔ وہ میرے لیے ایک عجیب سا معمہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس عقدے کو جتنا بھی میں حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اتنا ہی یہ اُلجھ جاتا ہے۔

اس نے جموں یونیورسٹی کے ایک ادبی سمینار میں مقالہ پڑھا تھا اور وہیں ہماری جان پہچان بھی ہوئی تھی۔ مقالے سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اردو ادب پر اس کی زبردست گرفت ہے۔ لنچ ٹائم پر میں نے اسے مبارک باد دی اور خلوصِ نیت سے اعتراف کیا کہ مقالہ بہت ہی فکر انگیز ہے۔ رسمی گفتگو کے بعد اس نے پرس میں سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دے دیا۔ لکھا تھا۔ ڈاکٹر مس کرونا چاولہ، ایم اے اردو، پی ایچ ڈی۔ بدلے میں میں نے بھی اپنا وزٹنگ کارڈ اس کو پیش کیا۔ پھر بڑی دیر تک باتیں ہوئیں اور اسی دوران مجھے یاد آیا کہ وہ میرے پروجیکٹ کے لیے معاون بن سکتی ہے۔ میں نے انہی دنوں ایک پروجیکٹ ہاتھ میں لیا تھا اور اس کے لیے مجھے کسی مددگار کی تلاش تھی۔

''آپ آج کل کیا کر رہی ہیں؟'' میں نے اُسے پوچھ لیا۔

''خاص کچھ نہیں۔ تھوڑا بہت ویلفیئر کا کام کرتی ہوں ۔ دیہاتی علاقوں میں ناخواندہ خواتین میں آگہی بڑھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''بہت خوب۔ دراصل میں پنجاب اردو اکادمی کے لیے ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں۔ موضوع ہے۔ 'شمالی ہند کی خواتین افسانہ نگار'۔ اس کے لیے مواد حاصل کرنے کی ضرورت ہے، پھر اس کا تجزیہ کرنا ہوگا اور آخر کار اس کو کتابی صورت میں پیش کرنا پڑے گا۔ تقریباً دو سال کا کام ہے۔ اکادمی ایک لاکھ روپیہ بطور اعزازیہ دے رہی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی اس پروجیکٹ کے ساتھ منسلک ہو سکتی ہیں۔''

اس نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ''دیکھتی ہوں'' کہہ کر رخصت ہوگئی۔

ہفتے بھر کے بعد جب میں اپنی میز کی صفائی کر رہا تھا، اس کا وزٹنگ کارڈ، جو کاغذات میں کہیں گم ہو گیا تھا، میرے سامنے فرش پر گر پڑا۔ میں نے فوراً کارڈ اٹھایا اور اس پر درج ٹیلی فون نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے کرونا کی آواز سنائی دی۔

''کرونا جی، میں منجیت سنگھ بول رہا ہوں۔ ہفتہ بھر پہلے آپ سے سمینار میں ملاقات ہوئی تھی۔''

''نمستے، کہیے، کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک پروجیکٹ کے بارے میں آپ سے گزارش کی تھی۔ اور آپ نے کہا تھا کہ میں سوچ لوں گی۔ کیا آپ نے اس بارے میں کوئی فیصلہ لے لیا ہے؟''

''اوہ سوری، میں تو بھول ہی گئی۔ میں نے اس طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ سچ مانیے، ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اب مجھے مزید پڑھنے لکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے معاف ہی فرمائیں تو بہتر ہوگا۔''

''کرونا جی، سال بھر ہی کی تو بات ہے۔ پھر معاوضہ بھی معقول مل رہا ہے۔ آپ کی ذہانت اور لگن کو دیکھ کر ہی میں نے آپ کو یہ پیش کش کی تھی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ آپ اصرار کر رہے ہیں تو کر لوں گی۔ کہیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''وہ تو ہم آفس میں بیٹھ کر ہی طے کریں گے۔ آپ کل صبح میرے آفس تشریف لے آئیے۔ وہیں تفصیل سے بات کریں گے۔''

''او کے، کل صبح گیارہ بجے میں آپ کے دفتر پہنچ جاؤں گی۔ گڈ بائی۔''

دوسرے روز وہ ٹھیک گیارہ بجے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے شعبے کے لائبریرین سے پروجیکٹ کی تفصیلات منگوائیں اور کرونا کے سامنے رکھ دیں۔ اسے پروجیکٹ سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور اگلے دن ہی وہ اپنے کام میں جٹ گئی۔

کرونا آفس میں کئی گھنٹے میرے ساتھ جم کر بیٹھ جاتی۔ ہر کام تندہی، دقیقہ ریزی اور اِتمام سے کرتی۔ کہاں تو میں نے ڈیڑھ دو سال کا نشانہ باندھا تھا اور کہاں چھ ہی مہینے میں نصف سے زیادہ کام مکمل ہو گیا۔

پیر سے شکر تک کرونا آفس میں کام نپٹا لیتی۔ پھر سنیچر اور اتوار کو میرے گھر پر آ کر کام کرتی۔ میں گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بے تکلف ہوتی گئی اور خود ہی چائے ناشتہ اور لنچ بھی بنانے لگی۔ ہاں کبھی کبھار موڈ بن جاتا تو ہوم ڈیلوری ریستوران سے من پسند کھانا منگوا لیتی۔

ایک روز میں نے خود ہی کھانا بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اس لیے کچن میں گھس گیا۔ اس سے رہا نہ گیا اور وہ بھی میری مدد کرنے کے لیے اندر آئی اور سبزیاں کاٹنے لگی۔ تب تک میں چکن فرائی کرتا رہا۔ سبزیاں کاٹتے وقت وہ میرے اتنے قریب کھڑی ہو گئی کہ ہم ایک دوسرے کے سانسوں کا زیر و بم اور بدن کی گرماہٹ محسوس کر رہے تھے۔ پھر یکا یک وہ ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے ہاتھ میں بھنڈی لیے میرے ساتھ چمٹ گئی۔ اس لمس سے میری آنکھوں میں اتنی غنودگی چھا گئی کہ یہ بھی دکھائی نہیں دیا کہ چکن پوری طرح فرائی ہوا یا نہیں۔ میں نے جلدی سے اس میں مصالحے ڈال دیے، حسب ضرورت پانی ملایا اور پھر پریشر کوکر کا ڈھکن بند کر کے سیٹیوں کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پھر سے سبزیاں کاٹنے میں منہمک ہو گئی اور خمار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔

''اب آپ باہر جا کر آرام سے بیٹھیے۔ سبزیاں اور چاول میں خود ہی بنا لوں گی۔''

''اب سبزی کی کیا ضرورت ہے۔ مرغی جو پک رہی ہے۔'' میں نے شرارت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

اس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور مجھے دھکا دیتے ہوئے کچن سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے بازو اس کے گلے میں حمائل کر دیے اور پھر اس کے موٹے رس بھرے ہونٹوں کو بوسہ دینے کی کوشش کی۔ اس نے جھٹ سے اپنا دایاں ہاتھ اپنے ہونٹوں کے اوپر پھیلا دیا اور مجھے بوسہ لینے سے روک دیا جیسے کوئی شجر ممنوعہ ہو۔ کئی بار کوشش کرنے کے بعد جب میں ناکام رہا تو

ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور خفگی سے اسے پوچھنے لگا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے؟''

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''تم نے اب تک جو کچھ بھی کیا میں نے روکا نہیں۔ مگر میں کسی کو بھی اپنے ہونٹ چھونے نہیں دیتی۔''

میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے ہونٹوں پر انسانی کھوپڑی اور دو ہڈیوں سے بنا ہوا خطرے کا نشان لگا ہوا ہو۔ مصلحتاً میں کچن سے باہر آ کر کھانے کی میز پر سکون سے بیٹھ گیا۔

کھانا اتنا لذیذ بن گیا تھا کہ دونوں انگلیاں چاٹ کر رہ گئے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر اور کام کرتے رہے۔ مگر دونوں عجیب سی تھکن اور بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ کام میں بالکل ہی جی نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے آرام کرنے کے لیے دونوں بیڈ پر لیٹ گئے۔ ہم آغوشی کی حالت میں بھی کرونا کے لب سلے رہے۔ وہ ان بند کواڑوں کو کھولنے سے بالکل انکار کرتی رہی۔ مجھ سے رہا نہیں گیا اس لیے بھید جاننے لیے کرونا سے پوچھ بیٹھا۔

''کرونا، ہمارے درمیان کوئی دیوار تو رہی نہیں۔ پھر بوسہ دینے سے تم انکار کیوں کر رہی ہو؟''

''نہیں دوں گی۔ میری مرضی.....'' اس نے بڑے روکھے انداز میں جواب دیا۔

''کچھ تو وجہ ہو گی میری جان۔ ان ہونٹوں میں ایسا کیا ہے جو یہ شجر ممنوعہ بن کر رہ گئے ہیں؟''

''یہ کسی کی امانت ہیں اور ہمیشہ اسی کے لیے ریزرو رہیں گے۔'' اس کے لہجے میں اعتماد بھی تھا اور اطمینان بھی۔

میری حیرانگی کی حد نہ رہی۔ ''کرونا نے اپنا جسم میرے حوالے کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا پھر بھی وہ اپنے ہونٹوں کو کسی کی امانت سمجھ رہی ہے، یہ کیسی دیوانگی ہے؟'' میں من ہی من میں سوچنے لگا۔ پھر میں نے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

''کس کی امانت ہیں۔ میں بھی تو سن لوں؟''

''میرے گائیڈ کی۔ گورو جی میرے ہونٹوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ بدقسمتی سے وہ شادی شدہ تھے اور دو بچوں کے باپ بھی۔ اس لیے میرے نہ ہو سکے۔ یہ ہونٹ میرے پہلے اور آخری پیار کی امانت ہیں۔ ان کی یادیں ہی میری زندگی کا واحد سہارا ہیں۔ وہ مجھے ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ اگر شادی

کرو گے بھی، یہ ہونٹ کسی کو چھونے نہیں دینا۔ ان سے بچھڑ کر میں نے عمر بھر کنواری رہنے کا فیصلہ کیا۔"

مجھے یہ سب پاگل پن لگ رہا تھا۔ مگر اندر سے آواز آئی۔ "آخر ایسے ہی پاگلوں کی وجہ سے یہ دنیا دلچسپ بن گئی ہے۔ ورنہ دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔ مہد سے لحد تک کا بے رونق سفر......! مجھے اس کے گائیڈ پر بھی ہنسی آرہی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ عورت شادی کرے اور شوہر کو اپنے ہونٹ چھونے سے روک لے۔ میں نے کرونا سے سوال کیا۔

"شاید تم نے جلدی میں فیصلہ لے لیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم کسی سے ہم آغوش ہو اور اپنے لبوں کو مہر بند کرو؟"

"مجھے نہیں معلوم میں نے اس وقت کیا فیصلہ لیا۔ صرف یہ جانتی ہوں کہ یہ ہونٹ اس کے ہیں اور اسی کے رہیں گے۔ البتہ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ میری بھی جسمانی ضرورتیں ہیں۔ کبھی کبھار ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تمہارے بازوؤں میں پناہ لیتی ہوں۔"

میں نے اس بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا تاہم اپنے رشتے کی وضاحت چاہی۔

"کرونا، ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے ہیں۔ میں تم سے بے حد پیار کرنے لگا ہوں۔ میری طلاق کی عرضی کورٹ میں دائر ہو چکی ہے۔ شاید چار چھ مہینے میں منظور ہو گی۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں..........."

اس نے میرا مکالمہ کاٹ کر بڑی بے رخی سے جواب دیا۔ "پیار......! یہ پیار ویار کہاں سے بیچ میں گھس گیا۔ خیر میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ مجھے تم سے پیار نہیں ہے۔ میں نے زندگی میں بس ایک بار پیار کیا اور ناکام رہی۔ اب اور کسی سے پیار نہیں کر سکتی۔ اس خیال کو تم دل سے نکال ہی دو۔"

اس نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا اور میں آگے کچھ بھی بول نہیں پایا۔

پروجیکٹ وقت مقررہ سے پہلے ہی مکمل ہو گیا اور میں نے مسودہ اکادمی کے حوالے کر دیا۔ جب اعزازیہ ملا تو چالیس ہزار کی چیک کرونا کو ان الفاظ کے ساتھ پیش کی۔ "بیس ہزار کاغذ، سٹیشنری، کمپوزنگ اور بائنڈنگ وغیرہ پر خرچ ہو گئے۔ باقی رقم کا آدھا حصہ تمہیں دے رہا ہوں۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور زوردار قہقہہ لگایا۔

"اس کو لے کر میں کیا کروں گی۔ بھگوان کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ پتا جی نے ایک

عالیشان بنگلہ چھوڑ دیا ہے۔ دو موٹر کاریں ہیں۔ کھیتوں سے اتنی کمائی ہوتی ہے کہ سال بھر کے اخراجات کے بعد بھی بہت کچھ بچ جاتا ہے۔ آپ اس رقم کو اپنے پاس ہی رکھ لیجیے۔'' اس نے بڑے پیار سے چیک کو تہہ کر کے میرے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیا اور پھر میرے ساتھ لپٹ گئی۔

''کرونا، یہ آفس ہے۔ کچھ تو خیال کرلو۔''

وہ الگ ہوگئی۔ میں ایک بار پھر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ اس باولی لڑکی کی ہر بات نرالی تھی۔

انہی دنوں کورٹ نے میری طلاق کی عرضی منظور کر لی اور میں نے دوسری شادی کرنے کی سعی کر لی۔ سب سے پہلے میں نے کرونا سے اس بارے میں بات کرنا مناسب سمجھا حالانکہ اس نے کئی بار اپنے خیالات سے مجھے آگاہ کیا تھا۔ خیر آدمی امید کا دامن عمر بھر نہیں چھوڑتا۔ میں نے یہی سوچا کہ شاید اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ اس لیے میں سیدھا کرونا کے گھر پہنچ گیا۔ والدین کی وفات کے بعد اب وہ اکیلی رہتی تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر میں اپنے مدعا کی طرف آ گیا۔

''کرونا، تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ کورٹ نے میری طلاق منظور کر لی ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔''

''سچ......! تھینک گاڈ......! یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تم اس مصیبت سے چھوٹ گئے۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آیا کہ تم دونوں نے پچیس سال کیسے اکٹھے گزارے؟''

''جیسے تیسے تو گزار ہی لیے۔ یہی دیکھونا، گذشتہ دس سال سے میں اکیلا ہی جی رہا ہوں۔''

''اب بچوں کا کیا کرو گے، تمہیں تو ان کی ہمیشہ فکر لگی رہتی ہے؟''

''ان کی وجہ سے ہی طلاق لینے میں اتنی دیر ہوئی۔ اب دونوں سیٹل ہو چکے ہیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم ختم کر چکے ہیں۔ نوکری تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔''

''تم اور تمہاری بیوی پر مجھے ترس آ رہا ہے۔ کیسے زندگی بسر کرتے رہے تم لوگ؟''

''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ کرونا، میں ایک تجویز لے کر آیا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے ٹھکراؤ گی نہیں۔''

''کہو کیا تجویز ہے؟''

''کرونا، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں......''

اس نے پھر میری بات بیچ میں ہی کاٹ لی اور کہنے لگی۔

''نو، اٹ از امپوسبل۔ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں شادی کے نام سے ہی نفرت کرتی ہوں۔تم برا مت ماننا۔میں کسی سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔منجیت، آئی ایم رئیلی ویری سوری''

''پر کیوں......؟''

''بس یوں ہی۔میں نے شادی نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔اور میرا فیصلہ اٹل ہے۔''

''کرونا......مگر تم سمجھتی کیوں نہیں۔آج تم جوان ہو، تمہارے ہاتھ پیر سلامت ہیں۔روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔مگر کل کو بڑھاپا آئے گا، بیمار ہو سکتی ہو، اس وقت تمہیں کسی کے سہارے کی ضرورت پڑے گی۔''

''منجیت، دراصل تم لوگ لحہ لحہ مرنے کے عادی ہو گئے ہو۔ مستقبل کی فکر تم سے تمہارا حال چھین لیتی ہے۔دیمک کی طرح چاٹ کھاتی ہے تمہارے حال کے ہر ثانیے کو۔ ذرا سوچو، تمہاری بیوی آج کس کے سہارے جی رہی ہوگی۔تم نے تو اس کو چھوڑ کر اپنا پلا جھاڑ لیا۔کل میرے ساتھ بھی یہ ہو سکتا ہے۔فرض کرلو اگر میں کسی کے ساتھ شادی کر بھی لیتی ہوں، کل وہ مجھے طلاق دے سکتا ہے یا پھر وہ مر بھی سکتا ہے۔پھر اس وقت میرا کیا ہوگا۔ہم نے یہ سب وہم پالے ہیں۔میں جیسی ہوں، جس حال میں ہوں، اچھی ہوں۔ مجھے بڑھاپے اور بیماری سے کوئی ڈرا نہیں سکتا۔جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔تب کی تب دیکھی جائے گی۔اس بارے میں آج ہی اپنا دماغ کیوں خراب کرلوں۔''

میرے دل میں بار بار یہ خیال آیا کہ اسے کہہ دوں کہ چلو مانا کہ تم ہی صحیح ہو پھر بھی شادی کرنے میں ہرج بھی کیا ہے۔آخر ہم دونوں کے درمیان جسمانی تعلقات تو ہیں ہی۔پھر سوچا کہ کہیں اس کے جذبات کو ٹھیس نہ لگ جائے اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔اس کے برعکس کرونا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''منجیت تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔میں نے زندگی کے پینتیس سال اکیلے ہی گزارے ہیں۔میں اپنے بیڈ روم میں کسی اور کا گماں بھی نہیں کرسکتی اور وہ بھی رات بھر۔آئی ہیٹ ٹو شیئر مائی بیڈ روم وِدھ اینی وَن۔''

اس نے بڑی متانت اور بے باکی سے یہ بات کہہ دی۔اس کے تیور بھی بدل چکے تھے۔میں نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ موضوع کو بدل دوں۔

''کرونا، چھوڑو ان باتوں کو...... میں نے یونہی نہ جانے کس جذبے کے تحت یہ پروپوزل

تمہارے سامنے رکھا۔ جب تمہاری مرضی نہیں ہے تو نہ سہی۔''

''ہاں منجیت، یہ میرا حتمی فیصلہ ہے اور مجھے فیصلہ بدلنے کی عادت نہیں ہے۔''

''اب بحث ہی کرتی رہو گی یا کچھ کھلاؤ پلاؤ گی بھی۔'' میں نے سنجیدہ ماحول کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

اس کے چہرے سے یک دم سنجیدگی کافور ہوگئی اور وہ پھر سے نارمل ہوگئی۔ پھر اس نے ٹیلی فون پر ڈنر کے لیے ہوم ڈیلوری ریستوران کو آرڈر دے دیا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں حسب معمول ایک دوسرے کی بازوؤں میں جھولتے رہے مگر آج پہلی بار میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ سارا ماحول اجنبی سا لگ رہا تھا۔ میں اس انوکھی لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اپنی زندگی لمحہ لمحہ جی رہی تھی۔ جس کا ماضی اور حال تضاد سے بھرپور تھا اور مستقبل تو اس کے لیے کبھی جنم ہی نہیں لیتا ہے۔



ٹھنڈی آگ

پہلی بار میں نے نرگس کو مینیجنگ ڈائریکٹر کے چیمبر میں دیکھا تھا۔ جیسا سنا تھا ہو بہو ویسا ہی پایا۔ اس کی موجودگی نے سارے کمرے کو معطر کر دیا تھا۔

چیمبر میں داخل ہوتے ہی مینیجنگ ڈائریکٹر مجھ پر برس پڑا۔ بورڈ میٹنگ میں اس کی کافی کھنچائی ہوئی تھی جس کا غصہ وہ اب میرے اوپر اتارنا چاہتا تھا۔ طیش کے باعث اس کا بدن بید کی طرح لرز رہا تھا اور منہ سے تھوکوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ایسے موقعے پر صفائی پیش کرنا تو درکنار اپنا منہ کھولنا بھی قہر کو دعوت دینے کے برابر تھا۔

اجنبی عورت کے سامنے اتنی پھٹکار سننے میں بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اپنی تذلیل کا یہ عالم تھا کہ چُلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

ادھر نرگس حقارت اور ترحم کے ملے جلے جذبات سے لگاتار مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ میں بھی نرگس کے ردعمل کو دیکھنے کے لیے اس کو بار بار کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔

دلکش بیل بوٹے دار دھانی ساڑی اوڑھے، امپورٹڈ عطر میں ملفوف وہ پچیس تیس برس کی عورت لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی عمر چھپانے کے لیے گہرے میک اپ کا استعمال کیا تھا۔ خضاب اور گودریج ڈائی سے بال رنگے تھے۔ ادھ ترشی لٹیں چہرے پر لٹکا رکھی تھیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور خوشنما تھیں لیکن

ان میں عجیب قسم کی تھکاوٹ اور بے بسی پوشیدہ تھی۔ فارین سینٹ کے بھبکے میرے نتھنوں کو چھید رہے تھے۔ دبیز میک اپ کے باوجود وہ اپنے چہرے کی جھریوں کو چھپانے میں ناکام ہوئی تھی۔

جو ہونا تھا سو ہو گیا مگر اس اہانت اور ذلت کی وجہ سے میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ میں نے اپنی صفائی پیش کیوں نہیں کی۔ اس بات کے لیے میں پشیماں تھا۔ پھر خود ہی اپنے آپ کو سمجھاتا کہ نوکری میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ بھلا اس کا اور میرا مقابلہ ہی کیا۔ وہ رہی انڈسٹریز منسٹر کی سالی اور میں ایک ادنیٰ سا ملازم۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔

اپنے مرتبے کے باعث وہ بہت ہی اثر ورسوخ والی تھی۔ آرگنائزیشن کے بیشتر ملازمین اس کی شخصیت سے مرعوب تھے۔ اس نے اپنے میل جول کا دائرہ محدود رکھا تھا مگر پھر بھی وہ سب کی نظروں کا مرکز بن چکی تھی۔ اس کے نخروں اور غمزوں کا چرچا ہر محفل میں ہوتا تھا۔

آفس میں نرگس کے بارے میں روز نئے نئے شگوفے چھوڑے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے ملازم، جو باریابی کے لیے ترستے مگر بات کرنے سے ڈر جاتے، اوچھے پن پر اتر آتے۔ قبریں کھود کھود کر اس کی نجی زندگی کی خبریں لاتے تھے۔

''وہ سسرال سے بھاگ کر بہن کے گھر میں رہتی ہے''

''وہ منسٹر بہنوئی کی رکھیل ہے۔ اسی کے شہ پر وہ سسرال چھوڑ کر آئی۔''

''اس کی بہن مجبوری کے سبب ان دیکھی کر رہی ہے۔ سوچتی ہو گی کہیں بات بگڑ نہ جائے۔''

''وہ شادی کے لائق تھی ہی کب جو کسی کی رکھیل بن سکے۔ اسے شوہر نے پانچویں دن ہی جسمانی خامیوں کی وجہ سے طلاق دی تھی۔''

یہ سب باتیں سن کر مجھے تسکین سی مل جاتی کہ چلو زندگی میں اسے بھی کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ آدمی جب اپنی توہین کا بدلہ نہیں لے پاتا تو اپنے حریف پر اترے آفات سماوی کی خبر سنتے ہی خوش ہو جاتا ہے۔

خلاف توقع مجھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس عورت سے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ ''مردوں کو طلاق دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے۔ کوئی دوسرا خوبصورت چہرہ دیکھ لیا تو اچھے اچھوں پر تہمتیں دھر دیتے ہیں۔ پھر نرگس کی کیا اوقات تھی۔ بہن کے گھر پر پڑی رہنے سے اس پر کیا گذرتی ہو گی کسی کو کیا معلوم۔'' میں اپنے دل میں سوچتا۔

ایک روز میں اتفاقاً کینٹین میں بیٹھا کوفی پی رہا تھا کہ جانی پہچانی خوشبو نے میرا احاطہ کرلیا۔ مڑ کر دیکھا تو دوسری میز پر نرگس بیٹھنے کی سعی کر رہی تھی۔ تعظیماً میں نے کھڑے ہو کر 'ہیلو' کہا۔

''ہیلو'' اس نے بھی گرم جوشی سے جواب دیا۔

''آیئے ادھر ہی بیٹھیے۔ میں کوفی منگواتا ہوں۔''

وہ کسی حیل و حجت کے بغیر میرے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کوفی پیتے ہوئے ہم دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ کچھ اپنے بارے میں اور کچھ آرگنائزیشن کے بارے میں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو رہی تھی۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ اسی لیے جیجا کی سفارش سے کمپنی میں انٹیریر ڈیزائنر کی نوکری کرنے لگی۔

اس کی صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔ اس نے اپنے متعلق کافی جانکاری فراہم کی مگر اپنی ناکام ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ نہ بولی۔ میں نے بھی اس بارے میں پوچھ تاچھ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اس ملاقات کے بعد اس کا میرے آفس میں آنا معمول بن گیا۔ لنچ ٹائم پر وہ اکثر میرے پاس آتی اور اپنا لنچ میرے ساتھ ہی کرتی۔ دھیرے دھیرے ہم دونوں آپس میں گھل مل گئے۔ بات بوس و کنار تک پہنچی۔ وہ میری گود میں آ کر بیٹھ جاتی اور میں اس کی چھاتیوں سے کھیلتا اور اس کی پنڈلیوں کو مسلتا۔ التہاب کے باعث دونوں اپنی حدیں بھول جاتے اور اس بات کو بھی بھول جاتے کہ ہم آفس میں بیٹھے ہیں۔

ابتدا میں اس کے بدن کی حرارت بہت بڑھ جاتی اور وہ انہماک کے ساتھ اپنی جیبھ اور انگلیوں سے میرے بدن کے تمام تر گوشوں کی کھوج لگاتی۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ بھڑکا ہوا شعلہ یکایک ٹھنڈا پڑ جاتا۔ اسے وہ پہلی سی طلب نہ رہتی۔ وہ تھک جاتی، اکتا جاتی اور پھر ہار مان کر اپنی قسمت سے سمجھوتا کرتی۔ کئی بار اس نے اپنی قوتوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ بڑے انہماک سے اس نے خود سپردگی کی سعی کی مگر ہر بار ناکام رہی۔ باوجودیکہ مجھے اس کے بھیتر گردش کر رہی سرد رَو کا احساس ہوتا تاہم میں اس کو اپنی بانہوں میں جکڑ کر رکھتا۔ اس کے لبوں پر بوسوں کی بارش کرتا۔ شدت جذبات سے کبھی کبھار اس کے ہونٹوں کو کاٹ لیتا، چھاتیوں کو نچوڑتا اور پٹھوں کو مسوستا۔ مگر موج آتی اور آ کر چلی جاتی۔ وہ بے بس ہو کر اسی مقام پر پہنچ جاتی جہاں سے وہ نکل پڑی تھی۔

اس کی ذہنی کشمکش کا تجزیہ کرنا میرے لیے کٹھن تھا۔ یا تو وہ اس حالت میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں

پارہی تھی یا پھر اسے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اس کی یہ چوری پکڑی نہ جائے تو وہ کہیں کی نہ رہ جائے گی۔

نرگس کے بدن سے آرہی تیز مصنوعی خوشبوئیں اس کے نفسیاتی تلاطم کا اعلان کر رہی تھیں لیکن مجھے کہیں بھی کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ آخر کار میں نے اس مسئلے کا حل ڈھونڈ نے کے لیے نرگس کو ڈنر کے لیے مدعو کیا۔

وہ انہی تیکھی اور شوخ خوشبوؤں میں ملفوف فاختئی رنگ کی ساڑھی پہنے میرے فلیٹ میں داخل ہوئی۔ اندر قدم رکھتے ہی سارا کمرہ عطر کی خوشبوؤں سے مہک اٹھا۔

اس نے ڈرائنگ روم کا غور سے جائزہ لیا اور پھر اپنی ساڑھی کو سمیٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''نائس روم......! آپ کی جمالیاتی حس کی داد دینی چاہیے۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہی گویا ہوئی۔

''تھینکس''میں نے جواب دیا۔

''یہ پینٹنگز اوریجنل ہیں کیا؟''

''ہاں۔ میرے ایک دوست نے تحفے کے طور پر دی ہیں۔ وہ خود پیرس میں جا بسا ہے۔''

''واؤ...... یو آر لکی۔''

''آپ کیا پئیں گی۔ جِن یا وہسکی؟'' تھوڑے وقفے کے بعد میں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ کوک چلے گا۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ جن، بیئر یا وہسکی۔ میرے پاس سبھی انتظام ہے۔

''مجھے ڈرِنکس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ گھر بھی تو واپس جانا ہے۔''

''بس تھوڑی سی لے لیجیے۔ جن بنا کر لاؤں کیا؟''

''ٹھیک ہے۔ آپ کہتے ہیں تو پی لوں گی!''

میں نے اُس کو جن کا جام پیش کیا اور خود وہسکی پینے لگا۔

''آپ اکیلے رہتے ہیں کیا......؟''

''ہاں، فی الحال تو اکیلا ہی رہتا ہوں۔''

''کھانا وغیرہ کون بناتا ہے؟''

''ایک مہری رکھی ہوئی ہے۔ وہی گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ کوئی خاص موقعہ ہو تو ہوٹل سے منگواتا ہوں۔ آج بھی ہوٹل ہی سے منگوایا ہے۔''

''اتنی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ پُر امید اور شہوت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

جوں جوں شراب کے گھونٹ حلق سے نیچے اترتے چلے گئے تکلف کے پردے ہٹنے لگے۔ میں نے نرگس کو اپنی جانب کھینچ کر بانہوں میں سمیٹ لیا۔ لپ اسٹک سے رنگے ہوئے ہونٹوں کا شہد چوسنے لگا۔ اس کے منہ کا لعاب جونہی حلق سے نیچے اترا سارے بدن میں الاؤ سا جل گیا جیسے دبے ہوئے شعلوں پر کسی نے پٹرول چھڑک دیا ہو۔ میری انگلیاں اس کی چولی اور پیٹی کوٹ کے حجابوں کو توڑتی ہوئی باغِ ارم میں گل چینی کرنے لگیں۔ نرگس خود سپردگی کی آرزو میں اپنے آپ پر قابو نہیں پا رہی تھی۔

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ یک دم ٹھٹک کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ہوٹل بوائے طعام لے کر آیا تھا۔

''کون......؟'' نرگس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

''کوئی نہیں۔ ہوٹل سے کھانا آیا ہے۔'' میں نے دلاسہ دیا۔ پھر میز پر ڈنر سجانا شروع کیا۔ وہ بھی میرا ہاتھ بٹانے لگی۔ وقتاً فوقتاً وہ میرے قریب آکر بوسہ لینے کے لیے اُکساتی، میرے بدن کے ساتھ چمٹ جاتی اور للچاتی آنکھوں سے مجھے ایسے گھورتی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''تم کیسے مرد ہو۔ ڈنر کے بدلے مجھے کیوں نہیں کھا جاتے۔''

ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد اس نے رسم نبھانے کے لیے شکریہ ادا کیا اور پھر گھر جانے کی اجازت مانگی جب کہ اس کے بدن کی زبان کچھ اور ہی بول رہی تھی۔

''اب مجھے جانا چاہیے۔'' اس نے اپنا پرس ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو نو ہی بجے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں بہت دیر ہوگئی۔ دیدی انتظار کر رہی ہوگی۔''

ایسے موقعوں پر باتوں سے زیادہ حرکتیں ترسیل کا کام کرتی ہیں۔ میں نے نرگس کو پھر اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور بوسہ دیتے ہوئے التماس کی۔

''آج رات یہیں ٹھہرو۔''

''اوہ نو۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔'' اس کی اداکاری سے صاف ظاہر تھا کہ وہ تصنع سے کام لے رہی ہے۔

''رہ جاؤ یار۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' میں نے اصرار کیا۔

''گھر میں اطلاع دینی پڑے گی۔حالاں کہ انہیں معلوم ہے کہ میں سہیلی کے ہاں گئی ہوں۔ نزدیک کوئی ٹیلیفون ہوگا؟''

ہم دونوں نیچے اترے۔نرگس نے ایس ٹی ڈی بوتھ سے گھر میں اطلاع دی۔واپسی پر دونوں بیڈروم میں گھس گئے۔اس نے ایک دلفریب ادائے شوخ سے اپنی ساڑھی اتار کر لاپرواہی سے سامنے کرسی پر پھینک دی اور گیسو اپنے شانوں پر بکھرا دیئے۔کپڑے اتار کر جب تک میں نائٹ گاؤن میں باتھ روم سے باہر نکلا اس نے اپنا گلاس دوبارہ بھر لیا تھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''وہاٹ اباوٹ یو......؟''

''وہائی ناٹ۔''میں نے جواب دیا۔

سونے کے زیورات سے آراستہ اور خوشبوؤں میں ملفوف وہ میرے لیے جام بھر کر لائی۔اس کو دیکھ کر عمر خیام بھی رشک کر لیتا۔اس کے چہرے پر عجیب سی چنچلتا اور شوخی عود کر آئی۔

میری آنکھوں میں بھی خمار سا چھا گیا۔میں نے عقابی پھرتی سے اس کو اپنے بستر پر دبوچ لیا اور اس کے لبوں کا رس پھر سے چوسنے لگا۔بڑی ملائمت سے انگیا کا بند کھول دیا اور پھر اس کے بدن کو پیٹی کوٹ سے بھی آزاد کر لیا۔

نائٹ بلب کی روشنی میں وہ سنگ مرمر کی مورت سی لگ رہی تھی۔اس کے بدن میں شعلے بھڑک رہے تھے۔وہ چاہتی تھی کہ ان شعلوں میں خود کو بھسم کر دے مگر اس کے جسم کی حرارت ایک بار پھر اسے دغا دے گئی۔پھر وہی سرد لہر اس کی رگوں میں دوڑنے لگی۔

وہ بہت کوشش کر رہی تھی کہ آج کی رات......بس آج کی رات وہ دہکتی رہے پھر چاہے عمر بھر اسے زندہ لاش کی طرح رہنا پڑے وہ کبھی اُف تک نہ کرے گی۔من میں اُس نے پیر بابا سے منتیں مانگی، چادر چڑھانے کا وعدہ کیا۔مگر اسے اپنی لاچاری کا احساس ہوگیا۔اس کے ماتھے پر بے شمار پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئیں۔اس کی حسرتیں، اُمنگیں اور ولولے سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

میں سمجھا شاید نرگس پھر ڈر گئی۔اس لیے مسلسل اس کو تسلیاں دیتا رہا۔اس کا خوف کم کرنے کے لیے کئی ترکیبیں عمل میں لائیں۔اس کی آنکھوں میں از سر نو امیدوں کے دیئے جلانے کی کوشش کی مگر کوئی ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔

اس انمول موقعے کو میں گنوانا نہیں چاہتا تھا۔میں نے سوچا کہ ایسی حالت میں دیر کرنا مصلحت

کے خلاف ہوگا۔اس لیے عجلت سے کام لے کر تھوڑی بہت زبردستی کرنے کی کوشش کی۔

نرگس زور سے چلائی اور اپنے تیز ناخن میرے بدن میں چبھو دیے۔ اس زورزبردستی سے وہ بالکل خائف ہوگئی۔ وہ کسی بھی صورت میں تعاون کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس کا بدن بالکل ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

دیر تک اختلاطِ راز و نیاز کے بعد یک بیک اجتناب کا یہ عالم میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

میری فطرت میں تعذیب شامل نہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو یہ چند لمحے روحانی مسرت حاصل کرنے کے لیے عطا ہوئے ہیں کسی ذی روح کو زخمی کرنے کے لیے نہیں۔ میں نے کسی مزاحمت کے بغیر ہی اپنے آپ کو روک لیا اور کروٹ بدل کر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

دیر تک اس کی سسکیاں میرے کانوں میں سنسناتی رہیں۔ پھر وہ ایک دم اٹھی، اپنے کپڑے اکٹھا کیے اور ان کو پھاڑنے لگی۔ وہ اپنے بالوں کو بھی نوچنے لگی اور اپنے پستانوں کو تیز ناخنوں سے زخمی کرنے لگی۔ اس کے بعد وہ زور زور سے رونے لگی۔

جتنی دیر میں میں اس کو روکنے میں کامیاب ہوا اس نے اپنی نئی ساڑھی، بلاوز اور انگیا سبھی کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور اپنے بدن پر کھرونچنے کے گہرے نشان لگائے تھے۔ پھر ہلکان ہو کر بے سدھ ہوگئی۔

دوسرے روز میں بازار سے لباس کا نیا سیٹ خرید کر لایا اور اس کے حوالے کر دیا۔ جھکی ہوئی نظروں سے اس نے بڑی ندامت کے ساتھ وہ پیکٹ قبول کر لیا۔



اندھے خوابوں کا عذاب

اس کے تین چہرے تھے ۔ ہندوؤں میں شریف چند، مسلمانوں میں شریف الدین اور عیسائیوں میں جون شیرف ۔ ابن الوقتی نے ہر چہرے کی قدر و قیمت سکھائی تھی ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے سکھوں، بودھوں، جینیوں یا پھر پارسیوں کے نام اختیار کیوں نہیں کیے ۔ شاید اسے ان مکھوٹوں کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی ہو یا پھر پاس پڑوس میں ان فرقوں کے لوگ رہتے ہی نہ ہوں ۔

وہ محدّب شیشہ لگا کر ان ناموں میں یا تو مالی فائدہ ڈھونڈتا یا پھر سماجی رتبہ ۔ جیب میں ایک تسبیح بھی رہتی تھی جس کی نمائش وہ وقتِ ضرورت مندر، مسجد یا گرجے میں کرتا ۔

شریف چند سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ انگریز رینجر مائیکل فراسٹ کی کوٹھی کے آوٹ ہاوس میں رہنے آیا تھا ۔ اس کا باپ، منی رام، بڑے صاحب کی کوٹھی میں خاکروب کا کام کرتا تھا ۔ بہت ہی نیک اور ایماندار آدمی تھا ۔ شریف چند نے اپنے باپ کو کبھی سیدھے کھڑے ہو کر صاحب کے ساتھ ہمکلام ہوتے نہیں دیکھا نہ کبھی آنکھ سے آنکھ ملا کر ۔ جب بھی کوئی گورا پاس سے گزرتا تو منی رام جلدی سے کسی کونے میں جھاڑو چھپا دیتا اور تب تک چپ چاپ وہیں کھڑا رہتا جب تک گورے صاحب کی سواری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتی ۔ آوٹ ہاوس میں رہنے کے باوجود منی رام نے اپنے بال بچوں کے لیے حدیں مقرر کی تھیں ۔ آوٹ ہاوس کی کس طرف کھیلنا

جائز ہے اور کس طرف کپڑے سکھانے کی اجازت ہے حتیٰ کہ عورتوں کو کس وقت گھر سے باہر نکلنا چاہیے اور وہ بھی سر پر لمبا پلو ڈال کر یہ سب باتیں اس نے فرداً فرداً گھر میں سمجھائی تھیں۔ اس بے وجہ نظم وضبط نے کم عمر شریف چند کے ذہن میں بغاوت کی چنگاریاں سلگا تو لیں مگر وہ لاشعور میں ہی دب کر رہ گئیں۔

منی رام چرٹ چلم کا عادی تھا۔ موقع ملتے ہی نزدیکی تکیے پر ایک پہنچے ہوئے فقیر کی چلموں میں آگ رکھنے چلا جاتا۔ فقیر تھا کہ جھاڑ پھونک اور عمل پڑھنا بھی جانتا تھا۔ سو منی رام پر مہربان ہو گیا اور اسے بھی یہ ہنر سکھا لیا۔ قسمت نے یاوری کی کہ ایک روز بڑے صاحب کی بیٹی روزی جنگل میں اپنی ہم جماعتوں کے ساتھ پکنک منا کر رات کو لوٹی تو تیز بخار نے دھر دبوچا۔ وید طبیب سب آزمائے گئے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار بات منی رام پر آ پہنچی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بڑے صاحب نے اپنی بیوی کی بات رکھ لی۔ کمرہ خالی کروایا گیا۔ صرف روزی پلنگ پر لیٹی رہی۔ منی رام نے چاروں کونوں میں اگربتیاں جلا کر رکھ دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ زور زور سے منتر پڑھتا چلا گیا۔ روزی سہم گئی۔ اس نے گردن میں لٹکی ہوئی صلیب کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد کرشمہ ہوا۔ دوسرے روز روزی اچھلتی کودتی باغ میں کھیلنے لگی۔ بڑے صاحب نے یہ معجزہ دیکھا تو اچنبھے میں پڑ گیا۔ سوچا کسی طرح منی رام کو اس کی نیکی کا صلہ دوں۔ پس اس کو محکمہ جنگلات میں صفائی کرمچاری کے عہدے پر مستقل طور پر تعینات کروالیا۔

سرکاری نوکری اور پھر گورے بچوں کی دیکھا دیکھی میں منی رام کی آرزؤں نے بھی اُڑانیں بھر لیں۔ بڑے صاحب کے اثر ورسوخ سے اس نے اپنے بیٹے شریف چند کو پاس ہی ایک مشنری سکول میں یہ سوچ کر داخلہ کروایا کہ شاید وہ بھی کسی روز بڑا صاحب نہیں تو کم سے کم بڑا بابو ضرور بن جائے گا۔ اسے احساس تھا کہ بڑے صاحب کی کرسی صرف انگریزوں کے لیے مخصوص ہے۔

چھوٹے لوگوں کی یہی بات مجھے اچھی لگتی ہے۔ اپنے خوابوں کے طائروں کے پر خود ہی کترتے رہتے ہیں تاکہ وہ معینہ حدود سے آگے اڑانیں نہ بھریں۔

یہیں سے شروع ہوتی ہے شریف چند کی تقلیبِ ماہیت۔ سکول کا ماحول گھر کے ماحول سے بالکل الٹ تھا۔ گرجا گھر کا پادری 'فادر' اور راہبائیں 'سِسٹر' کہلاتی تھیں۔ صبح دم جب بھی ان کا سامنا ہوتا تو منہ سے ایک دم 'گڈ مارننگ' اُبل پڑتا۔ جواب میں وہ لوگ بھی مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے خوشدلی سے 'گڈ مارننگ' کہہ دیتے۔ نہ کوئی بھید بھاؤ اور نہ کوئی اونچ نیچ۔ ان کے سامنے سبھی بچے

ایک جیسے تھے۔ وہ اتوار کو گرجا گھر بھی جانے لگا تھا۔ وہاں فادر ڈی سوزا بائبل پڑھ کر سناتا، اس کے معنی سمجھاتا اور پھر یسوع مسیح کی عظیم قربانیوں کا ذکر کرتا۔ اس طرح فادر ان غریب پسماندہ لوگوں کو عیسائیت کی برتری اور سماجی مساوات کا احساس دلاتا۔ اور وہ آہستہ آہستہ اس مذہب کی جانب راغب ہوتے رہتے۔ نہ کوئی سوال اور نہ کوئی شک وشبہ۔ کسی نے کبھی یہ بھی نہ پوچھا کہ بڑے صاحب کے سامنے منی رام سر اٹھا کر بات کیوں نہیں کر سکتا۔ اسے عیسائیوں کی باتیں ہی نرالی لگتی تھیں۔ اکثر و بیشتر شریف چند بائبل سننے کے بجائے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا۔ لمبا سفید چوغا پہن کر وہ خود کو کبھی فادر ڈی سوزا اور کبھی جیکٹ و برچس پہن کر بڑا صاحب تصور کرتا۔ انہیں حسین خوابوں کے حصول کے لیے شریف چند جون شیرِف بن گیا۔

ہماری دوسری ملاقات ۲۰/ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک دارو کے اڈے پر ہوئی۔ میرا مطلب ہے باضابطہ ملاقات ورنہ تو میں نے کئی بار اس کو دیکھا تھا، گھر میں، اسکول میں اور گرجے میں۔ اس روز وہ شراب پی کر بہک گیا تھا۔

''جون، وہاٹ از دِس۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ گریجویٹ ہو۔ پھر اتنی شراب؟'' میں نے براہ راست سوال کیا۔

''وہائی ناٹ مَین، یہ سالا انگلش لوگ بھاگ گیا ہم کو ادھر چھوڑ کر۔ اب ہم کدھر جائیں گا۔ ہم عیسائی بن چکا ہے۔ جون شیرف......! کل تک جن کے سامنے سر اونچا کر کے چلتا تھا اب انہی کے سامنے سر جھکا کر چلنا پڑے گا۔ کیا خبر یہ دیسی لوگ اب ہمارا کچومر بنائیں گا۔''

تھوڑی دیر رک کر وہ پھر بولا۔

''سالا یہ انگلش مین! تم کو خبر ہے کتنا لیڈی لوگ سے شادی بنانا اور کتنے ناجائز بچے پیدا کیا۔ ان کو انگلینڈ کا سپنا دکھایا۔ اور اب دُم دبا کر بھاگ گیا۔ اُن کو یہیں چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ بلیک ہے۔ کدھر جائیں گا وہ لوگ؟ ان کے بچے؟ سالا یہ انگلش لوگ بھی دھوکے باز نکلا۔ ہم کو یہیں چھوڑ کر چلا گیا۔''

''پھر تم نے کیا سوچا......؟'' میں نے کریدا۔

''ابھی کچھ بھی نہیں سوچا۔ ابھی تو بس دارو پییں گا۔ انگریزی دارو ہے۔ معلوم نہیں کل ملے گا یا نہیں......! سالا یہ انگلش مین، ہم کو یہیں چھوڑ کر چلا گیا۔''

اور وہ بہکتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ مجھے اس پر رحم آ گیا۔ میں نے ایک ٹانگے والے کو بلا کر

اس کوتانگے پر گھر بھجوادیا۔

جون شیرف کوسب سے بڑادھچکا تب لگا جب کچھ دنوں کے بعداس کے محلے میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔ زندگی میں پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ وہ مسلمانوں سے چاروں طرف گھرا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کے آباواجداد مردہ جانوروں کا چمڑا کمانے اوراس کی دباغت میں ماہر تھے۔ اس لیے انہوں نے اونچی ذات کے ہندوؤں سے دور مسلمانوں کی بستی کے پاس اپنی بستی بنائی تھی۔ ان کے گھروں میں یا توان سادھوسنتوں کے فوٹو تھے جنھوں نے ان کواپنے حقوق کا احساس دلوایا تھا یا پھر عیسیٰ کی تصویریں تھیں کیونکہ انہوں نے اپنا مذہب بدل دیا تھا۔ حالات کو دیکھ کر جون شیرف کچھ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ مکانوں سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ محلے کے محلے نذرآتش ہورہے تھے۔ خون پانی سے ارزاں ہو چکا تھا۔ ہرروز کوئی نہ کوئی خبر ملتی۔ ایک نیا ہنگامہ بپا ہوتا۔ اس کی برداری والے سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر زمین وجائیداد جون شیرف کے پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ انگریزوں کے زمانے میں اس نے اپنی چاپلوسی سے بہت ساری زمینیں ہڑپ لی تھیں۔ مذہبوں کا کیا، وہ تو پہناوے ہیں جب چاہے بدل لو۔ البتہ املاک پھر کہاں مل جاتی ہیں۔

جون شیرف نے اپنے چہرے پر ایک اور مکھوٹا چڑھا دیا۔ سر پر کلاہ لگائے ہوئے میں نے اس کو مسجد سے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے اپنا نام بدل کر شریف الدین رکھ لیا۔ گھر میں بھی سبھی لوگوں کا وضع قطع بدل گیا اور مسلمان پڑوسیوں سے میل میلاپ بھی بڑھنے لگا۔ یہی وہ لوگ تھے جنھیں وہ کبھی اپنے برابر نہیں سمجھتا تھا۔ اسے بخوبی یاد تھا کہ جب اس نے کباڑی سے کسی انگریز کی اُترن، سوٹ، قمیض اور ٹائی خرید لیے تھے۔ تو اس پر خوب استری کروا کر بازار کے بیچوں بیچ اتراتا ہوا چلنے لگا تھا۔ بازار میں لوگ اُسے بڑی عزت سے سلام کرنے لگے تھے اور یہی لوگ جن کے ساتھ وہ اب رسم وراہ بڑھانے لگا تھا، احساس کمتری سے سر جھکایا کرتے تھے۔

پھر دھیرے دھیرے منظر بدلتے رہے۔ یہ بات اب یقینی ہوئی کہ رنگ پور ہندوستان میں ہی رہے گا۔ اس لیے مسلمان آبادی کا بیشتر حصہ پاکستان کے مشرقی حصے میں جابسا۔ شریف الدین کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہوا کہ ہندو بننے میں بڑا فائدہ ہے۔ ان دنوں آریہ سماج کے کاریہ کرتا ایسے لوگوں کا شدھی کرن کرکے واپس ہندو مذہب اختیار کرنے میں مدد کرتے تھے۔ یونین پبلک سروس کمیشن کا فارم بھرتے وقت شریف الدین نے بڑے فخر سے اپنا نام شریف

چندولد منی رام لکھا۔ آبائی پیشے کی سرٹیفکیٹ بنوا کر فارم کے ساتھ نتھی کر لی۔ حالاں کہ اب بھی اس کے دل میں گرجا گھر کے لیے وہی تعظیم تھی جو بچپن میں ہوا کرتی تھی۔ خیر ماحول اب سازگار ہو چکا تھا۔ نوکری پانے کے لیے وہ شریف چند تو بنا تھا مگر پھر بھی اتوار کو گرجا گھر میں ضرور حاضری دے دیتا اور وہاں کے پادری سے آشیر وارد بھی لیتا۔ اس کو انگریزوں سے ایک ہی قلق تھی وہ یہ کہ انگریزوں نے جن ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کی تھیں یا ان کو رکھیل بنایا تھا اور جائز و ناجائز بچے پیدا کیے تھے، جن کے نام مائیکل یا جون یا پیٹر رکھے گئے تھے، ان سب کو وہ بے سہارا ہندوستان میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایک بار مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ۔ کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ مسیحی بچے ان کے جانے کے بعد کس کے سہارے جئیں گے۔

شریف چند ولد منی رام ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا مرکزی حکومت میں سکریٹری کے عہدے تک جا پہنچا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی جنگ اس دن شروع ہوئی جب سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ سنا ما کہ ریزرویشن صرف ان پسماندہ طبقوں کو حاصل ہوگی جو اس کے مستحق ہوں گے۔ کورٹ نے حکومت لو ان طبقات کی بالائی سطح متعین کرنے کے احکامات جاری کیے۔ جن کو اب ریزرویشن کی ضرورت نہیں ہے۔ شریف چند کے سامنے اپنے بچوں کا مستقبل تھا جس کو وہ کسی طور خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے فائیل میں ایک لمبا نوٹ لکھ دیا کہ پانچ ہزار سال سے پسِ رہی پسماندہ ذاتیں ابھی ذات پات کے امتیازی پنجوں سے پوری طرح آزاد نہیں ہو پائی ہیں۔ ایسی ذاتوں کا کوئی بھی فرد ایسا نہیں ہے جس کو بالائی سطح میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تو طبقاتی جنگ کا آغاز ہوا ہے۔ ابھی منزلیں بہت دور ہیں۔

دراصل اب شریف چند اپنی ذات کا نیا برہمن بن چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی برادری کا کوئی اور شخص اس کی ہمسری کرے۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ مستقبل میں اس کی برادری کا کوئی بھی شریف چند تقلیبِ ماہیت کر کے اس کے جیسا مقام حاصل نہ کر سکے۔ جب تک اس کی برادری کے لوگ غریب اور پسماندہ رہیں گے تب تک اس کی برتری قائم رہے گی۔ شریف چند کی نظریں سبکدوشی کے بعد سیاسی میدان پر بھی لگی ہوئی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ ووٹ ڈالنے کے لیے شریف چند جیسے آسودہ پڑھے لکھے لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر نکلتے ہیں تو یہی پسماندہ لوگ جو اپنی آنکھوں میں روٹی، کپڑا اور مکان کے خواب سجائے الیکشن بوتھ تک پہنچ جاتے ہیں۔ گرم جھلسا دینے والی ہواؤں میں وہ

گھنٹوں قطار باندھے اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور ووٹ ڈالتے وقت انہیں ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے اب اپنی قسمت کا اہم فیصلہ کرلیا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ شریف چند جیسے ابن الوقتوں کو اقتدار کی آخری منزل تک پہنچا رہے ہیں۔

شریف چند سے میری آخری ملاقات اس کے ڈرائنگ روم میں ہوئی تھی۔ عالیشان کوٹھی، سجا سجایا ڈرائنگ روم، ایرانی قالین، برماٹیک کے صوفے اور کرسیاں۔ بڑے صاحب مائیکل فراسٹ اگر یہ ٹھاٹ باٹ دیکھتے تو حیران ہو جاتے۔ شریف چند صوفے پر براجمان تھے۔ سامنے فرش پر دو چار آدمی بیٹھے ان کی تقریر سن رہے تھے۔ دو آدمی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ اور وہ انہیں ایسے ہی برتاؤ کر رہا تھا جیسے انگریز حاکم اس کے باپ سے کیا کرتے تھے۔ وقت کا پہیہ شاید پورا گھوم کر یہاں تک پہنچ چکا تھا۔



پروٹوکول

حق تو یہ ہے کہ میں کئی لحاظ سے چغد ہوں۔ چغد اس لیے کہ مجھے نہ اس بات کی خبر کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، نہ یہ معلوم کہ آج کل کون سا نیا فیشن عام ہو رہا ہے اور نہ ہی یہ آگہی کہ لڑکیاں ترقی کی کس منزل کو چھو رہی ہیں۔ میرے چغد ہونے کا اندازہ آپ کو یوں ہوگا کہ کالج کے دنوں میں میں نے تعلیم یافتہ، شریف الذات اور نیک سیرت لڑکی سے شادی کرنے کے خواب دیکھے تھے مگر اچانک ایک ایسی لڑکی سے میری نسبت تقریباً طے ہوگئی جو اس کسوٹی پر بالکل کھری نہیں اترتی تھی۔

واقع یوں ہوا کہ میں کسی دفتری کام کے سبب سرینگر سے جموں چلا گیا اور وہاں ایک قریبی رشتے دار کے پاس ٹھہرا۔ رشتے دار کی لڑکی کی سگائی پہلی منزل پر رہ رہے کرائے دار سے طے ہوئی تھی۔ اڑچن صرف اتنی تھی کہ لڑکے کی بڑی بہن ابھی بن بیاہی تھی۔ اس لیے جب تک بڑی بہن کی شادی نہ ہو جاتی، لڑکے کی شادی ناممکن تھی۔

سبھی لوگ کسی مرغے کی تلاش میں تھے کہ سامنے ایک اہل ناکتخدا کو دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ میں پڑھا لکھا تو تھا ہی۔ پھر نوکری بھی کر رہا تھا۔ البتہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ میری نوکری میں ٹھاٹ باٹ تو تھی مگر میری تنخواہ بہت کم تھی۔ رات ڈنر ٹیبل پر انہوں نے میری رائے دریافت کرنے کی کوشش کی مگر میں نے ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کہ اس بارے میں میرے والدین ہی فیصلہ کر پائیں گے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ میں لڑکی کو ہوٹل وغیرہ لے جا کر اسے گفتگو کروں اور اس کے خیالات جان

لوں، اگر پسند آئے تو بات آگے بڑھ سکتی ہے۔ ورنہ والدین تک یہ تجویز لے جانا فضول ہوگا۔ بات معقول تھی۔ دوسرے روز سینما دیکھنے اور ہوٹل میں چائے پینے کا پروگرام بن گیا۔

ڈنر کے بعد سبھی لوگ بڑے کمرے میں جمع ہو گئے۔ مجوزہ لڑکی بھی اوپر آ کر ہمارے درمیان بیٹھ گئی۔ مرد عورتیں، چھوٹے بڑے سبھی لوگ ہم دونوں کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر میں رکھے ہوئے جانور ہوں۔ دریں اثنا میری کزن نے اُس لڑکی سے کوئی فلمی گانا سنانے کی فرمائش کی۔ کامنی نے طلعت محمود کی گائی ہوئی اسرار الحق مجاز کی نظم 'اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں ......' نہایت ہی دلکش اور مترنم آواز میں گائی۔ نظم نے مجھے دیوانہ کر دیا کیونکہ یہ میری پسندیدہ نظم ہے۔ میں کامنی کا گرویدہ ہو گیا اور اسے شادی کرنے کا آدھا من بنا لیا۔

دوسرے روز ہم اُتم سنیما میں فلم دیکھنے چلے گئے۔ ان دنوں جموں ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ کرن نگر سے لے کر گاندھی نگر تک۔ ہر گلی جانی پہچانی لگتی تھی۔ اُتم سنیما کے باہر ایک دوست ملا۔ اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا مگر نظریں میرے ساتھ والی لڑکی پر جمی تھیں۔ اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر رازدارانہ انداز میں پوچھ لیا۔

''یار، یہ مال کہاں سے اٹھا کر لائے ہو؟''

میں حیران ہو گیا کہ میرے دوست کو کیا ہو گیا۔ اس لیے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ میری منگنی ہونے والی ہے۔''

باقی ساری باتیں دوست کے حلق میں اٹک کر رہ گئیں۔ وہ مصلحتاً آگے کچھ بھی نہ بولا حالانکہ اس کے چہرے کے تاثرات اس کے ذہن میں اٹھ رہے سوالات کی چغلی کر رہے تھے۔

بہر حال ہم دونوں 'رام تیری گنگا میلی' فلم دیکھنے کے لیے گیلری میں بیٹھ گئے۔ چنانچہ فلم لگاتار چھ مہینوں سے چل رہی تھی، گیلری تقریباً خالی تھی۔ بس دو چار جوڑے کہیں کہیں نظر آ رہے تھے۔ سنیما حال کی تاریکی میں کامنی نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا اور آبشار کی مانند اس کے لہراتے ہوئے بال میرے سینے پر پھیل گئے۔ ان کی مہک سے میں مدہوش سا ہو گیا۔ ادھر اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے کر مجھے اپنی گرماہٹ کا احساس دلایا۔ میں نے بھی موقعے کا فائدہ اٹھا کر اس کے کپکپاتے ہونٹوں پر ایک طویل بوسہ ثبت کیا اور پھر اپنی انگلیوں سے اس کی ٹھوس اور کسی ہوئی چھاتیوں کی گولائیاں ناپنے لگا۔ اس نے میک اپ بھی کچھ ایسا کیا تھا کہ فلمی ماڈل جیسی لگ رہی تھی۔ تاہم لباس بھڑکیلا نہیں

تھا۔ میری کم علمی کا یہ عالم تھا کہ مجھے یہ بھی اندازہ نہ ہو پایا کہ اس نے اپنی چھاتیوں کو ٹھوس اور نمایاں بنانے کے لیے مصنوعی آلات اور دوائیوں کا استعمال کیا ہے۔

سنیما سے نکلے تو کیلاش ہوٹل پہنچے۔ وہاں چائے اور ناشتے کا آرڈر دیا۔ میں خود اٹھ کر واش روم میں ہاتھ دھونے کے لیے چلا گیا۔ واپسی پر سامنے بیٹھے منیجر نے، جو مجھے بخوبی جانتا تھا، ہیلو کہہ کر اپنے پاس بلایا اور لڑکی کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔ اس کو بھی جب یہ معلوم ہوا کہ وہ میری ہونے والی منگیتر ہے تو خاموش ہو گیا مگر میرے دل کا اضطراب اب بڑھنے لگا۔

سرینگر پہنچتے ہی میرے تجسس میں مزید شدت آ گئی۔ میں سوچنے لگا کہ آخر ایسی کونسی بات ہے جس کے باعث ہر کوئی کامنی کو دیکھتے ہی تعجب کا اظہار کر رہا ہے حالانکہ دل کہہ رہا تھا کہ لوگوں کا کیا، لوگ تو یونہی بدنام کرتے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔

کشمیر میں جسم فروشی پر مکمل پابندی ہے۔ یہاں ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح کہیں کوئی ریڈ لائٹ ایئریا بھی نہیں ہے۔ پھر کیوں وہ ہر کسی کی آنکھ کا کھٹکا بن چکی ہے؟ میں نے لڑکی کے بارے میں چھان بین شروع کی اور آخر کار میرا شک صحیح نکلا۔ کامنی کی بدکرداری کے چرچے عام تھے۔ وہ اکثر ہاوس بوٹوں اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں اجنبی لوگوں کے ہمراہ دیکھی گئی تھی۔ مجھے خود پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ ساتھ ہی یہ یقین بھی ہوا کہ شرافت اور خلوص دور حاضر میں آدمی کو ڈبو سکتے ہیں۔

کچھ مہینے گزر جانے کے بعد ایک روز کامنی مجھے جہلم کے کنارے بنڈ پر ملی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرا دی۔

''ہائے کمل کیسے ہو......؟''

''گزر رہی ہے۔ تم بتاؤ، تمہارا کیا حال ہے؟''

''میں بھی اچھی ہوں۔ تم پھر کبھی جموں نہیں آئے؟''

''میں صرف دفتری کام سے جموں جاتا ہوں۔ اس کے بعد کبھی دفتر والوں نے بھیجا ہی نہیں۔ تمہارا بھائی کیسا ہے؟''

''اس کی سگائی ٹوٹ گئی۔ آپ کے وہ رشتے دار ہیں ناں۔ کسی نے ان کے کان بھر دیے اور انہوں نے سگائی توڑ دی۔''

''اوہ آئی سی۔ تو پھر شادی کینسل؟''

''ہاں کینسل، میرے بھائی نے اس مکان سے بھی شفٹ کر لیا ہے۔''

''اور تم......تمہاری شادی......!''میں نے عمداً یہ سوال پوچھا۔
''میں......!''اس نے قہقہہ مارااور پھر گویا ہوئی۔''مجھے تو شادی کے نام ہی سے نفرت ہے۔ میں آزاد پنچھی ہوں۔ وہ لوگ مجھے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھینک گاڈ۔ بھگوان نے مجھے ان بیڑیوں سے بچالیا۔''
''میں سمجھا۔''جی میں آیا کہ کہہ دوں انگور کھٹے ہیں مگر کہہ نہیں پایا۔ البتہ یوں گویا ہوا۔''دراصل آدمی کو وہی کرنا چاہیے جو اس کا دل کہتا ہو۔'' کہنے کو تو میں نے یہ الفاظ کہہ دیے مگر دل میں شکر کرنے لگا کہ چلو بلا ٹل گئی۔ اس کے بعد میں نے پوچھا۔''اس وقت کہاں جا رہی ہو؟''
''بس یونہی ایک سہیلی کے پاس جا رہی ہوں۔''
''کوفی پینا پسند کرو گی......؟''
اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور توقف کے بعد جواب دیا۔
''ہاں کیوں نہیں۔''
میں اس کو لے کر براڈوے بار اینڈ ریستوران چلا گیا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ ایک وہی جگہ ہے جہاں اطمینان سے بیٹھ کر اس کے ساتھ گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ایک نیم اندھیرے کونے میں پہلے میں بیٹھ گیا اور پھر وہ میرے بغل میں بیٹھ گئی۔
بیٹھتے ہی میں نے اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ آج نہ وہ چہرے پر رونق دکھائی دے رہی تھی، نہ سینے میں وہ ابھار تھا اور نہ ہی آنکھوں میں وہ چمک تھی۔
''شاید گھریلو کام کر کے یونہی تفریحاً نکل آئی ہو اور میک اپ کرنا بھول گئی ہو۔''میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دو بیئر اور دو کباب کے پلیٹ منگوائے۔ کامنی نے آرڈر دیتے وقت کوئی عذر پیش نہیں کیا۔ صرف مجھے ترستی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ میں اپنی پلیٹ سے کباب کا ٹکڑا اٹھا کر اس کے ہونٹوں کے پاس لے گیا۔ وہ مسکرائی اور پھر آنکھوں سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کباب منہ میں لے لیا۔ اس کے حلق سے جتنی ٹھنڈی بیئر اُتر رہی تھی اُتنا ہی اس کا بدن تپ رہا تھا۔ ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لے کر میں اس کی چھاتیوں کو گوندھنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کا انگ انگ مستی میں ڈوب گیا۔ باتوں باتوں میں ہم دونوں نے اپنی زندگی کی کتاب کھول کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دی۔
کامنی نے مجھے بتایا کہ وہ دراصل ریاستی سرکار کے پروٹوکول دفتر سے وابستہ ہے اور اس کا کام

صرف وی آئی پی حضرات کی خاطر داری کرنا ہے۔

''وی آئی پی......! میں سمجھا نہیں''، میں نے استفسار کیا۔

''ہاں وی آئی پی......! اسٹیٹ گیسٹ......! فارین ڈگنیٹریز یعنی غیر ملکی مہمان......! ملک کے سب سے اونچے عہدیدار سے لے کر ریاست کے عہدیداروں تک......اور پھر کبھی کبھی......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اوہ آئی سی۔ اس کام میں تو تمہیں بڑا ہی لطف آتا ہوگا۔ ایک تو اتنے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے اور پھر کبھی کسی سے کوئی کام پڑ جائے تو آسانی ہوتی ہوگی۔

''خاک لطف آتا ہے'' وہ بپھر گئی اور پھر سوچے سمجھے بغیر ہی ابل پڑی۔ ''مجھے تو ان لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں ہی گھن آتی ہے۔ سالے بوڑھے کھوسٹ، ایک ٹانگ قبر میں ہوتی ہے اور دوسری میرے بدن پر۔ ان کے بدبودار باسی بدن سونگھ سونگھ کر مجھے الٹیاں آنے لگتی ہیں۔

''تم کو ان کے بدن کے ساتھ کیا غرض......وہ بوڑھے ہوں یا پھر جوان......تمہارا کام تو صرف خاطر تواضع ہے۔'' میں نے مزید کریدنے کی غرض سے پوچھا۔

''تم تو بالکل چغد ہو۔ ابھی تک سمجھے نہیں۔ مجھے نہ صرف ان کا دل بہلانا پڑتا ہے بلکہ ان کے بدن کو بھی ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔''

''کیا؟''......مجھے ہزار وولٹ کا کرنٹ جیسا لگا۔ ان لوگوں کی خاطر تواضع میں یہ بھی شامل ہے؟''

''ہاں۔ یہی میرا کام ہے۔ یہ وزیر......یہ اعلیٰ حکام......جب بھی وادی کی سیر کرنے آتے ہیں، یہاں کی دوشیزائیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ کشمیری بیوٹی، کشمیری بیوٹی......! بس یہی رٹ لگاتے ہیں۔ ہمیں ان کی ہر ضرورت پوری کرنی پڑتی ہے۔ میں ایک اکیلی تھوڑی ہوں۔ میرے ساتھ اور بھی تو کئی لڑکیاں ہیں۔ بھگوان جانے ان سالوں پر کیا بھوت سوار ہو چکا ہے......کشمیری بیوٹی......!''

''پھر تو خوب کمائی ہوتی ہوگی اور پرسنل بخشش بھی تو ملتی ہوگی۔'' میں نے سنجیدگی کو کم کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''ہوتی ہے۔ مگر نہ جانے کہاں بھاپ بن کر اڑتی ہے۔ اپنے رکھ رکھاؤ پر بھی ہمیں بہت خرچ کرنا پڑتا ہے۔'' کامنی اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

''تم اس جال میں کیسے پھنس گئی۔ تمہیں پہلے سے معلوم نہیں تھا؟ میں نے بیئر کا گھونٹ حلق سے

نیچے اتار کر پوچھا۔

''ہم تین بہنیں ہیں ۔ بھائی کوئی نہیں ۔ پتاجی نے ماں کو عشق کے جال میں پھنسانے کے سوا زندگی میں اور کوئی کام نہیں کیا۔ ماں بے چاری پرائمری اسکول میں ٹیچر تھی ۔ پتاجی نے ساری عمر طفیلیا بن کر گزار دی۔ سارا کنبہ ماں کی کمائی پر پلتا رہا۔ دو بہنوں کی شادی ہوئی۔ گھر میں اکال سا پڑ گیا۔ پھر ماں بھی ریٹائیر ہوگئی اور پنشن پر گھر بار چلانا مشکل ہو گیا۔ ماں کے ایک ہمدرد نے اس کو مشورہ دیا کہ تمہاری بیٹی کامنی کو پروٹوکول میں جاب مل سکتا ہے کیونکہ وہ خوبصورت بھی ہے اور انگریزی بھی اچھا بولتی ہے۔ ماں بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ اس نوکری کی کئی اور شرطیں بھی ہیں۔ اس نے حامی بھر لی اور میں اس دلدل میں پھنس گئی۔''

''اس دلدل سے نکلنے کا کوئی ارادہ ہے کہ نہیں؟''

''کیسے نکلوں ۔ میرے ساتھ اب کون شادی کرے گا۔ کوئی بھی نہیں ۔ پھر گھر بھی تو چلانا ہے۔ ماں باپ کا بوجھ بھی اب میں ہی اٹھا رہی ہوں ۔ ہاں ایک دو آدمی لٹو ہو گئے تھے مجھ پر مگر آخر کار وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ایک صاحب نے تو اپنی ماروتی گاڑی بھی دے دی ۔ دو تین مہینے میری پاس رہی ۔ پھر وہ سالا واپس لے کر غائب ہو گیا۔ اب سوچتی ہوں کہ مجھے اس گاڑی کے پیپر اپنے نام کروانے چاہیے تھے۔ ان معاملات میں تو میں ہمیشہ بیوقوف ہی نکلی۔''

''کبھی اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا ہے تم نے؟''

''اس میں سوچنا ہی کیا ہے۔ میری زندگی اس تنکے کی طرح ہے جو دریا کی موجوں کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ موجیں جدھر لے جائیں گی ادھر چلی جاؤں گی۔''

میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی ۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس لیے کامنی سے کہنے لگا۔

''رات بہت ہو چکی ہے۔ اب چلنا چاہیے۔''

''او کے، جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میرے ساتھ ہوٹل کے باہر آ گئی۔ میں نے ٹیکسی منگوا کر اس کو گھر کے پاس چھوڑ دیا اور پھر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ میں پورے راستے یہی سوچ رہا تھا کہ کیسی کیسی زندگی جینے پر لوگ مجبور ہو جاتے ہیں گاندھی جی کی اس پوتر دھرتی پر ۔ پھر اندر سے کوئی غیبی آواز آئی۔

''اس میں دھرتی کا کیا دوش۔ عورت کا استحصال تو طلوع تہذیب کے ساتھ ہی شروع ہوا تھا۔ وہ کبھی امرپالی بنی، کبھی انارکلی اور کبھی کامنی......!



افلاس کا کوڑھ

اس روز کسی کام سے مجھے اورینٹل انشورنس آفس جانا پڑا۔ سواگت کے لیے دفتر کا منیجر گراونڈ فلور پر ہی میرا انتظار کر رہا تھا۔ پھر ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل تک آ گئے۔ بالکل سامنے ایک دروازہ تھا جس کی بغل میں منیجر صاحب کی تختی لٹک رہی تھی۔ جونہی ہم دروازے کے پاس پہنچے ایک وردی پوش چپراسی نے چہرے پر مسکراہٹ اوڑھ کر سلیوٹ کیا اور دروازہ کھولنے لگا۔ چپراسی کو دیکھتے ہی میں ٹھٹھک گیا اور کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کے ساتھ بغل گیر ہوا۔

''نرمل سنگھ، تم...؟ تم یہاں پر کب سے نوکری کر رہے ہو؟''

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اس کی نگاہیں اپنے منیجر کا تعاقب کر رہی تھیں۔ جھینپتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

'' سر یہی کوئی آٹھ سال ہو گئے۔ سکول کے ترنت بعد ہی میں نے ملازمت شروع کی تھی۔ آپ....آپ کیسے ہیں؟ آج کل کیا کر رہے ہیں؟''

''دو سال پہلے میں نے سول سروسز کا امتحان پاس کر لیا اور اب یہاں سینئر سپر نٹنڈنٹ پوسٹ آفسز کے عہدے پر تعینات ہوں۔''

''سر آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔''

میرے ہمراہ جو انشورنس کمپنی کا منیجر تھا وہ تذبذب میں نظر آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے قطع کلام کر کے آگے قدم بڑھایا۔ منیجر اس بات سے پریشاں تھا کہ اتنا بڑا افسر ہو کر بھی میں ایسے معمولی ملازم

سے بغل گیر ہوا۔ میں اس کے ردِ عمل سے ہی سمجھ گیا۔ اس لیے خود ہی وضاحت کی۔ ''آپ کو معلوم ہے ہم دونوں سکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔''

''سکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے؟ کس سکول میں؟'' اس نے مزید تعجب کا اظہار کیا۔

''گورنمنٹ سکول کرن نگر میں۔''

''میں تو سمجھا تھا کہ آپ نے کسی پبلک سکول میں تعلیم پائی ہوگی۔ عام طور پر پبلک سکولوں کے طلبا ہی سول سروسز میں کامیاب ہوتے ہیں۔ نرمل سنگھ ہمارے یہاں کئی سالوں سے کام کر رہا ہے۔ بڑا ایماندار اور نیک بندہ ہے۔ اسی لیے میں نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔''

پھر ہم دونوں دفتری کام میں مصروف ہو گئے۔ فارغ ہو کر میں واپس اپنے دفتر چلا گیا مگر وہاں کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا کیوں کہ مجھے وہ دن یاد آ رہے تھے جو میں نے نرمل سنگھ کے ساتھ بتائے تھے۔

ہم چار دوست تھے۔ چار یارِ غار۔ جہاں بھی کہیں جاتے اکٹھے جاتے، جو کچھ بھی کرتے اکٹھے کرتے۔ ترلوک تیز طرار، وجیہہ اور ذہین تھا مگر یتیمی کے باعث پیسے پیسے کا محتاج رہتا۔ غربت نے اس کے جوہر کو کبھی پنپنے نہیں دیا ورنہ وہ بھی بہت بڑا افسر ہوتا۔ جب اس کی قوت کسی تعمیری کام میں صرف نہ ہوتی تو وہ اس کا استعمال داداگری اور سکول کے دوسرے لڑکوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کرتا۔ اس کے سبب سبھی لڑکے ہمارے گروپ سے دور ہی رہتے تھے۔ دوسرا سُریش تھا۔ لمبا، کم گو مگر کاہل۔ صبح ناشتہ کرنے میں تقریباً آدھا پون گھنٹہ لگا دیتا۔ ڈرپوک اتنا تھا کہ لڑائی جھگڑوں میں کبھی براہ راست حصہ نہ لیتا لیکن ایسے موقعوں پر ہمارے بستے پکڑنے کے کام آتا۔ تیسرا ساتھی نرمل سنگھ تھا جو کسی بات میں بھی ہم سے آگے نہ تھا البتہ اس کی اہمیت اس لیے زیادہ تھی کیوں کہ وہ ہمارا سگریٹ سپلائر تھا۔ سگریٹ پینے کی لت اسی نے ہمیں ڈالی تھی۔ اس کا باپ سگریٹ کی پرچون دکان پر کام کرتا تھا اور نرمل سنگھ کسی نہ کسی بہانے اکثر دکان پر پہنچ جاتا اور چپکے سے بلبل سگریٹ کی ڈبیا چرا کر لے آتا۔ ان دنوں بلبل سگریٹ کی قیمت محض دو پیسے ہوا کرتی تھی۔ سکول سے چھٹی ہونے کے بعد ہم گلیوں میں چھپ کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ چاروں دوستوں میں میری مالی حالت قدرے اطمینان بخش تھی اور پڑھنے لکھنے میں بھی مجھے سبقت حاصل تھی۔ سکول کے بعد ہم سب الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

آفس کی اس ملاقات کے بعد ایک روز نرمل سنگھ مجھ سے ملنے میرے گھر آیا اور ہم دونوں اپنی بیتی ہوئی زندگی کے اوراق الٹتے رہے۔

نرمل سنگھ جن دنوں سکول میں پڑھتا تھا اس کے گھر کے سامنے ایک لڑکی جمنا رہتی تھی جس کی ماں بیوہ تھی۔ وہ گھر گھر کام کر کے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پالتی۔ نرمل سنگھ کا جمنا کے گھر آنا جانا تھا اور وہ اس کی پڑھائی میں بھی مدد کرتا۔ کبھی کبھی وہ جمنا کے بارے میں کہانیاں سنا کر ہمیں حیرت میں ڈال دیتا کیوں کہ ہم ایسے کسی تجربے سے نہیں گزرے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد جمنا کی ماں کو کینسر کا عارضہ ہوا اور وہ چل بسی۔ جمنا بالکل اکیلی پڑ گئی۔ اس لیے سر چھپانے کے لیے اپنی موسی کے گھر چلی گئی۔ وہ اس چھوٹی عمر میں ہی گھر گھر کام کرنے لگی البتہ اس کا گدرایا ہوا بدن اور موٹی نشیلی آنکھیں اس کے دُشمن بن گئے۔ وہ جہاں بھی کام کرتی، اس گھر کے مرد اسے گھورتے اور طرح طرح کے لالچ دیتے مگر وہ ازار بند کی سچی نکلی کسی کے جال میں نہ پھنسی۔ شامت کی ماری کب تک بچ پاتی۔ ایک روز لالہ خوب چند کے ناخلف بیٹے جنگی نے موقعہ پا کر نہتی جمنا کو جبراً اپنے کمرے میں دبوچ لیا اور اس کے بعد بھی وہ اس کو ڈراتا دھمکاتا رہا تاکہ وہ کسی کو خبر نہ کرے۔

جمنا کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ مفلسی آدمی کو نہایت کمزور اور ڈرپوک بنا دیتی ہے۔ پولیس تھانے میں رپورٹ لکھواتی تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پولیس والے اُلٹا اسی کی بوٹیاں نہ نوچ ڈالیں۔ گھر میں موسی کو بتاتی تو ہو سکتا تھا کہ گھر ہی سے نکال دی جاتی۔ اس لیے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی اور چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اُدھر جنگی اس کا مسلسل استحصال کرتا رہا جب تک اس کا نطفہ ٹھہر گیا۔

جمنا کی پریشانیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ اِدھر گھر میں بتانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اور اُدھر جنگی نے بالکل ہی منہ پھیر لیا۔ ایک روز راہ چلتے اتفاقاً نرمل سنگھ مل گیا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

"جمنا، تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ میں تو لٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔ مجھے اب آتم ہتھیا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔" نرمل سنگھ میں اس کو اپنا واحد سہارا نظر آنے لگا۔ وہ آنکھوں سے خون بہا رہی تھی اور آگے کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔

"کچھ بولو گی بھی یا نہیں۔ ایسی کونسی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ کہیں موسی نے گھر سے نکال تو نہیں دیا؟"

"نہیں، اسے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔"

"کس بارے میں معلوم نہیں؟ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتی۔"

"نرمل، جس گھر میں میں کام کرتی تھی ان کے لڑکے نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میرے ساتھ زور

زبردستی کی اور اب میرے پیٹ میں اس کا......." اس نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

نرمل سنگھ سب کچھ تاڑ گیا۔ وہ کافی دیر سوچتا رہا مگر اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ بالآخر اس نے اپنے دل کو سمجھایا کہ اس میں بیچاری جمنا کا کیا قصور ہے۔ وہ تو کسی درندے کا نوالہ بن چکی ہے۔ پھر جمنا کو دلاسہ دینے کے لیے وہ گویا ہوا۔

"بس اتنی سی بات ہے۔ اسی بات کے لیے تم خودکشی کرنا چاہتی ہو۔"

"یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے نرمل۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"بیوقوف مت بنو۔ یہ زندگی انمول ہے۔ اسے گنوانا اچھا نہیں۔ تم کل صبح دس بجے مجھے بڑا بازار میں ملنا۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

دوسرے دن نرمل سنگھ جمنا کو لے کر کچہری پہنچا اور اس کے ساتھ شادی رجسٹر کروائی۔ جمنا کو اپنی آنکھوں پر وشواس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کبھی نرمل سنگھ کو دیکھ رہی تھی اور کبھی اپنے پیٹ کو۔

نرمل سنگھ نے اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ دی۔ گھر میں جگہ نہیں ملی تو ایک کوٹھی کے خالی گیراج میں رہنے لگا۔ دن بھر مزدوری کرتا اور رات بھر کوٹھی کی رکھوالی۔ بیوی اسی کوٹھی میں جھاڑو پونچھا کرنے لگی۔ مالک دونوں کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے اپنی کمپنی میں نرمل سنگھ کو ڈیلی ویجز پر لگوا دیا۔ دھیرے دھیرے وہ مستقل طور پر اسی کمپنی میں چپراسی کے عہدے پر تعینات ہو گیا۔

چھ سات مہینے بعد جمنا نے ایک خوبصورت لڑکی کو جنم دیا۔ اس کے بعد دو اور لڑکوں کو جنم دیا۔ نرمل سنگھ کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے دنیا کی ساری دولت پائی ہے۔

متوسط طبقے کا میرا ذہن بات کو کچھ سہار نہ سکا۔ میں جھٹ بول پڑا۔ "تم نے یہ جان کر بھی کہ جمنا کی پیٹ میں دوسرے کا پاپ پل رہا ہے، اسے قبول کر لیا؟

"مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ مان لو شادی کے بعد اس کا کہیں ٹانکا لگ جاتا اور وہ اس کے بچے کو جنم دیتی تو پھر کیا ہوتا؟" مجھے اپنے سوال پر شرمندگی محسوس ہوئی تاہم میں نے اپنے تجسس کو مٹانے کے لیے پھر پوچھا۔ "کیا تم اس بچی سے پیار کرتے ہو؟"

"اپنے بچوں سے بھی زیادہ۔ مجھے تینوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔"

نرمل سنگھ کا جواب سن کر میں اپنی حماقت پر شرمندہ ہو گیا۔ وہ بلبل کی مانند میرے سامنے چہک رہا تھا۔ شاید بلبل سگریٹوں کا اثر ابھی تک باقی تھا۔



جزیرے پیار کے

تینتیس سال کی نوکری کے بعد آج میں ڈاک خانے کی ملازمت سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔ میں نے پہلی بار سرینگر میں سینئر سپر انٹنڈنٹ کا چارج لیا تھا۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کل کی بات ہو۔

ڈاک خانے سے میرا تعلق بچپن ہی سے رہا ہے۔ کبھی خط و کتابت کے لیے، کبھی منی آرڈر بھیجنے کے لیے یا پھر کبھی برٹش لائبریری کو کتابیں لوٹانے کے لیے۔ ان دنوں یہ محکمہ زندگی کے ہر شعبے سے جڑا رہتا تھا لیکن اب تو خدا ہی حافظ ہے۔ آجکل یہ بحر بیکراں کے ساحل پر کھڑے دیو ہیکل جہاز کی مانند لگ رہا ہے جو پراگندہ ہونے کی تاک میں بیٹھا ہوا ہے۔

ملازمت سے پہلے کی کچھ ایسی یادیں بھی ہیں جو مسلسل ذہن کو معطر کرتی رہتی ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں اچھی نوکری کی تلاش میں تقریباً ہر روز ایک دو درخواستیں بھیجنے کے لیے سرینگر جی پی او کے چکر لگایا کرتا تھا۔ ایک روز کاونٹر پر پہونچا تو کاونٹر کلرک نے بڑی بدتمیزی سے رجسٹری کرنے سے انکار کر دیا۔

''دیکھتے نہیں ٹائم ختم ہو گیا ہے۔''

''محترمہ ابھی دو بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔''

''میں نے کہا نا اب رجسٹری نہیں ہو سکتی۔ ہمیں حساب بھی تو ملانا ہوتا ہے۔'' وہ کرخت لہجے میں بولی۔

بغل میں کھڑے کسی آدمی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''بھائی صاحب، آپ دیکھتے نہیں وہ سامنے اس کا بوائے فرینڈ موٹر سائیکل پر ہارن پر ہارن بجائے جا رہا ہے۔ اسی لیے جلدی مچی ہوئی ہے۔''
خیر ہوئی کہ اس نے سنا نہیں ورنہ اس آدمی کو کچا ہی چبا جاتی۔

''میڈم مجھے آج ہی رجسٹری بھیجنی ہے۔ آج لاسٹ ڈیٹ ہے۔''

دور کسی اور کلرک کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس کو مجھ پر رحم آ گیا۔ وہ زیر لب مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''لایئے مجھے دیجیے۔ میں رجسٹری بک کر لوں گی۔''

میں نے لفافہ اس کے سپرد کر دیا اور کنکھیوں سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس نے شتابی رسید لکھ کر مجھے سونپ دی۔

''آپ نے تو مجھے ممنون کر دیا۔'' مجھے شکریہ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

''آپ تکلف کر رہے ہیں۔ یہ تو میرا فرض ہے''۔ اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''ایسے پھر کبھی دیر ہو جایا کرے تو آپ سیدھے میرے پاس اس کمرے میں آیا کیجیے۔''

''وہ تو فلیٹلی کا کمرہ ہے.....!''

''ہاں میں وہیں پر کام کرتی ہوں۔''

اس دن کے بعد میں نے کاونٹر پر جانا ہی بند کر دیا اور سیدھے فلیٹلی والے کمرے میں جا کر لفافے اس کے سامنے رکھ دیتا۔ وہاں پر وہ اور اس کی سہیلی ہوتی۔ بارہا میں ان کے ساتھ دیر تک گفتگو میں محو ہو جاتا البتہ جب فرصت نہ ہوتی تو لفافے ان کے سپرد کر کے شام کو رسید لینے چلا جاتا۔ ثمینہ نے کئی بار مجھے فلیٹلی کے بارے میں طرح طرح کی جانکاری دی اور ساتھ ہی چائے بھی پلاتی رہی۔ پھر یہ ملاقاتیں نہ جانے کب اور کیسے معاشقے میں بدل گئیں۔ ابتدا میں وہ میرے پہناوے اور طرز گفتگو سے یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میں پردیسی ہوں اور سیاحت کی غرض سے کشمیر آیا ہوں مگر اس کی حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی جب وہ مجھے زینہ کدل جا رہے ٹمپو میں ملی۔ اس نے اپنے تجسس کو مٹانے کی خاطر بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھا۔ ''آپ یہاں کیسے؟''

''گھر جا رہا ہوں۔''

''گھر......؟'' وہ مجھے دیکھنے کے بجائے اپنی سہیلی کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں، میں زینہ کدل ہی میں رہتا ہوں۔''

''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''آپ نے کبھی پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تو میں کیسے بتاتا۔''

''خیر اب تو بتا سکتے ہیں۔''

''امن....''

''آپ کشمیری پنڈت ہیں؟''

''جی ہاں....''

وہ مسلسل اپنی ہندو سہیلی کی جانب دیکھتی رہی۔ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے اسے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ نہ تو میں پردیسی تھا اور نہ ہم مذہب۔ وہ دُبدھا میں پڑ گئی۔ خیر اب قدم پیچھے ہٹانا بھی اس کے لیے دشوار تھا۔ اس لیے زندگی کی پتوار قسمت کے حوالے کر کے وہ لہروں کے ساتھ بہتی رہی اور ہمارا عشق آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا۔

ثمینہ ہنس مکھ، زندہ دل اور خیامی (epicurean) تھی۔ بڑی اچھی شکل وصورت کی مالک تھی مگر قد میرے مقابلے میں ذرا چھوٹا تھا۔ میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ میری زندگی میں جتنی بھی لڑکیاں آئیں ان میں اکثر و بیشتر قد کی چھوٹی کیوں تھیں؟ شاید نفسیاتی طور پر وہ مجھ سے منسوب ہو کر اپنے احساسِ کمتری سے نجات پانا چاہتی تھیں۔ دھیرے دھیرے میں اور ثمینہ عشق کے مقناطیسی عمل کی زد میں آکر یہ بھول ہی گئے کہ مذہبوں کے اختلاف کے سبب ہم ایک روز ایک دوسرے سے ضرور جدا ہو جائیں گے۔ اس معاملے میں کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اقلیتی فرقے کا معمولی سا لڑکا کیسے اکثریتی فرقے کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ ہم دونوں اپنے خاندانوں اور برادری کے معصوم لوگوں کی لاشوں پر اپنے پیار کا تاج محل کیسے کھڑا کر سکتے تھے؟ ہم عصرِ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ آج بھی ہم مذہبی بندشوں اور منافرتوں میں قید ہیں۔ اس جال سے ہمیں نہ تعلیم آزاد کر پائی اور نہ ہی سائنسی فکر و عمل۔

سال ڈیڑھ سال ہی میں میرا حلیہ بدل گیا۔ دہلی میں غلط طریقوں سے کمائی ہوئی دولت بھاپ بن کر اڑ گئی۔ سوٹ، سویٹر اور قمیض پارہ پارہ ہونے لگی تھیں۔ کم و قلیل تنخواہ میں نئے کپڑے خریدنا بعید از قیاس تھا۔ ثمینہ کو بھی اس تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ ایک روز اس نے خوبصورت ڈیزائن کا ایک سویٹر

میری بہن کے ہاتھوں یہ کہہ کر بھیج دیا۔ ''بھیا سے کہہ دو پھٹی پرانی سوئیٹر پہن کر باہر نہ نکلا کرے۔ اچھا نہیں لگتا۔''

میں نے سوئیٹر پہن لی جو بالکل میرے ناپ کی بنی ہوئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے میرے ایک دوست، جو میری طرح ہی وجیہہ تھا، کا ناپ لے کر سوئیٹر بنوایا تھا۔ ثمینہ کے اس فعل نے مجھے بہت متاثر کر دیا۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب جیب خالی ہو جاتی ہے تو لڑکیاں منھ موڑ کر چلی جاتی ہیں مگر ثمینہ تو کسی اور ہی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ وہ میری گرتی ہوئی مالی حالت کو برداشت نہ کر سکی اور اپنی کم و قلیل تنخواہ سے اس میں پیوند لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بھی جب اسے پورا یقین تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کبھی نہیں ہو سکتے ہیں۔

ادھر مجھے ہمیشہ اپنی کسمپرسی کا احساس رہا۔ اس لیے میں ہر دم یہی کوشش کرتا رہا کہ اپنا کیریئر سنوار لوں۔ سال ڈیڑھ سال ہی میں میں نے سول سروسز کا امتحان پاس کر لیا اور مصوری میں تربیت کے دوران میرا الاٹمنٹ لیٹر بھی آیا۔ مجھے پوسٹل سروسز میں الاٹ کیا گیا۔ الاٹمنٹ لیٹر پڑھتے پڑھتے مجھے ثمینہ کی بہت یاد آئی۔ جی کرتا تھا کہ اڑ کر سب سے پہلے اس کو یہ خبر سناؤں۔

چھٹیوں میں سرینگر پہنچتے ہی میں نے ثمینہ کو یہ خبر سنائی۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھتی رہی۔ مجھے بحیثیت باس دیکھنا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس وقت بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کو بانہوں میں سمیٹنے والا مجنوں کبھی اس کا باس بھی بن سکتا ہے۔

اور پھر ایک روز وہی ہوا جو ہونا تھا۔ میرا ٹرانسفر سرینگر ہوا۔ شروع ہی سے میرے ذہن میں یہ تذبذب رہا کہ ثمینہ کو دیکھ کر میرا ردعمل کیسا ہوگا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ اب افسری تھی، صاحب بہادر کہنے والے ملازم تھے، گاڑیاں تھیں، رعب داب تھا اور پھر ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

ایک روز ہیڈ کلرک میری میز پر کلرکوں کا لمبا چوڑا ٹرانسفر آرڈر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے موقعے کو غنیمت جان کر ثمینہ کا ٹرانسفر ایسی جگہ کر لیا جہاں وہ مہینے میں تنخواہ کے علاوہ کم سے کم تین چار ہزار روپے بطور کمیشن کما سکتی تھی۔ میں نے سوچا اس طرح اس کی عنایتوں کا تھوڑا بہت قرضہ تو اتر سکتا ہے۔ اس میں اڑچن بس اتنی تھی کہ اس کا آفس گھر سے پانچ کلومیٹر دور تھا اور اس کو روزانہ دو بسیں بدلنی پڑتیں۔ اس آفس میں پوسٹنگ کے لیے کئی سفارشیں آ چکی تھیں مگر میں نے سب کو نظر انداز کر کے ثمینہ کو وہاں بھیج دیا۔

آرڈر ملتے ہی ثمینہ میرے آفس پہنچ گئی اور کمرے میں داخل ہوتے ہی زور زور سے کہنے لگی۔ ''مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ بھلا نہیں کر سکتے ہو، نہ کرو مگر برا بھی تو نہ کرو۔ کیا سارے شہر میں میں ہی ایک بچی تھی کہ ٹینی یور ختم ہونے سے پہلے ہی مجھے اتنی دور پھینک دیا۔''

کمرے میں میرے سامنے سی بی آئی کا ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ بیٹھا ہوا تھا۔ ثمینہ کے طرز تخاطب کو دیکھ کر میرا دل گھبرا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ پولیس والا ہے جلدی بھانپ جائے گا۔ اس لیے میں نے فوراً حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ثمینہ کو سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور میز پر پڑی مٹھائی کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لو یہ مٹھائی کھالو۔'' پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا۔

''کیا تم نے اپنی تین پسندیدہ جگہوں کی فہرست آفس کو بھیجی تھی؟''

''کیوں بھیجتی۔ میرا تو ابھی ٹینی یور بھی مکمل نہیں ہوا۔''

''ٹھیک ہے، میں ریکارڈ چیک کرلوں گا اور اگر ایسا ہے تو تمہارا آرڈر بدل دوں گا۔''

میں اسے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے ہی تمہارا ٹرانسفر نئے آفس میں کیا تھا اور کتنے لوگوں کی دشمنی مول لی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس جگہ کے لیے کہاں کہاں سے سفارشیں آئیں تھیں۔

چائے پی کر وہ چل دی اور میں نے راحت کی سانس لی۔ دوسرے روز اس کو گھر کے نزدیک ہی ایک آفس میں تعینات کر دیا۔

بہت عرصہ گزر جانے کے بعد اتفاق سے ایک ایسی جگہ اس کا سامنا ہوا جہاں میں کھل کر بات کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ثمینہ مجھے معلوم ہے کہ تم اس روز مجھ سے ناراض ہوگئی تھیں مگر میں نے تو تمہاری بھلائی کے لیے ہی تمہارا ٹرانسفر کیا تھا۔ سوچا تھا کہ تنخواہ کے علاوہ تم چار پانچ ہزار مہینے میں کما سکو گی لیکن تمہیں میری بات راس ہی نہ آئی۔''

وہ حیرت سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر ہنس کر بولی۔ ''اور دن میں دو بسیں بدلنی پڑتی۔ صبح ایک گھنٹہ پہلے گھر سے نکلنا پڑتا اور شام کو اندھیرے میں گھر واپس پہنچ جاتی۔''

''روپے کمانے کے لیے تو کچھ مشکلیں اٹھانی ہی پڑتی ہیں۔''

''بھاڑ میں جائیں تمہارے روپے۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا نے مجھے جتنا دیا ہے، کافی ہے۔ چند روپیوں کے لیے میں اپنا سکھ چین نہیں گنوا سکتی۔'' اس کے چہرے پر بشاشت تھی، اطمینان تھا

اور سکون تھا۔ میں اپنے کیے پر نادم ہو گیا۔ میں نے اس کی محبت کو دولت کے ترازو میں تولنا چاہا تھا مگر وہ تھی کہ کسمپرسی میں بھی مجھے محبت کا سبق سکھا گئی۔

آج اس واقعے کو پیش آئے ایک زمانہ بیت چکا ہے۔ اس دوران زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر چلتی رہی۔ ہم دونوں نے وقت کے ساتھ مفاہمت کر کے اپنے اپنے ہمسفر چن لیے، بچے پیدا کیے اور دل کے زخموں پر یادوں کے پھاہے لگائے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں جب بھی کبھی ایک دوسرے سے یوں ہی ملاقات ہو جاتی ہے تو دونوں کے چہرے تمتما اٹھتے ہیں اور دل میں خوشیوں کا ایک طوفان سا اٹھتا ہے۔ ہم نے بارہا مندروں اور خانقاہوں میں ایک دوسرے کی خوشحالی کے لیے دعائیں مانگی ہیں اور یہ کبھی بھی نہ سوچا کہ غیر مذہبوں کے لیے یہ دعائیں قبول ہونگی بھی یا نہیں۔



کیبرے ڈانسر

اندھیرے ہال میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں یا یوں کہیے تھرک رہی تھیں۔ ان کے جلنے بجھنے کی جھلملاہٹ آرکسٹرا کی دھن سے ہم آہنگ ہورہی تھی۔ ہر چہرے پر انتظار ہی انتظار نظر آرہا تھا۔ میزوں کے اردگرد بیٹھے ناظرین ہاتھوں میں شراب کے جام لیے ہوئے آپس میں محو گفتگو تھے۔ جو مے خوار نہیں تھے وہ کوک یا پیپسی سے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ کوئی اطمینان سے دھیرے دھیرے پی رہا تھا گویا پینے کے علاوہ زندگی میں اور کوئی کام نہ بچا ہو اور کوئی جلدی جلدی گھونٹ پر گھونٹ حلق سے نیچے اتارے جارہا تھا جیسے اس کو اپنی زندگی پر کوئی بھروسہ ہی نہ ہو۔

آہستہ آہستہ آرکسٹرا کی دھن تیز سے تیز تر ہوگئی اور پھر ایک دھماکے کے ساتھ کیبرے ڈانسر ہال میں وارد ہوئی۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ دراز قد، مرمریں جسم، غلافی آنکھیں اور ربڑ کی گڑیا کی مانند بدن میں لوچ چند ہی لمحوں میں ہر سو کیف و سرور کا سماں چھا گیا۔ وہ بڑی ہنرمندی کے ساتھ بل کھاتی ہوئی ڈائس سے نیچے اتر آئی اور میزوں کا طواف کرتی ہوئی منتظر ناظرین کے ساتھ مصافحہ کرنے لگی۔ ہر کسی کے دل میں یہی تمنا جاگ اٹھی کہ رقاصہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی کے ساتھ بتائے تا کہ وہ اس کے قرب سے محظوظ ہوتا رہے۔ اس بھیڑ میں چاند پر کالے بالوں کا پیوند لگائے بزرگ بھی تھے، بے دریغ روپیہ لٹانے والے شادی شدہ مرد بھی تھے اور شہوت کی آنچ میں تپ رہے نوجوان بھی تھے۔

ہال میں ایک کرسی پر میں بھی بیٹھا تھا۔ ان دنوں میں لال بہادر شاستری اکادمی آف ایڈمنسٹریشن، مصوری میں تربیت پا رہا تھا۔ مصوری کے لوگ اسے 'اکادمی' کے نام سے جانتے ہیں۔ دو چار دوستوں نے اس رات ہیک مینز ہوٹل میں کیبرے دیکھنے کا پروگرام بنالیا سو میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔ رقاصہ میری کرسی کے نزدیک آئی، مسکرائی اور پھر التفات بھرے لہجے میں 'ہائے' کہہ دیا۔ میں نظریں جھکائے بدستور کوکولا پیتا رہا اور اس کو نظر انداز کرتا رہا۔ اس نے تھوڑی دیر انتظار کیا مگر میری بے رخی کو دیکھ کر وہاں سے کھسک گئی۔ شاید برا بھی مان گئی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ واپس ڈائس پر پہنچی۔ پھر فلمی دھنوں پر لہراتی رہی اور ناظرین کے جذبات کو بھڑکاتی رہی۔ دفعتاً اس نے نہیں کے برابر اپنے لباس کی اوپری تہہ ایسے اتار دی جیسے لہسن کا چھلکا اتار رہی ہو۔ ناظرین سمجھے وہ اپنے جسم کو عریاں کرنے جا رہی ہے لیکن وہ تو ان معاملوں میں مشاق تھی۔ چولی اور لہنگا کے نیچے ایک اور چولی اور لہنگا ابھر آئی اور اس طرح ستّر پوشی برقرار رہی۔ بہر حال ناظرین کے لیے یہی پیش بندی کافی تھی۔

رقص کا پہلا دور ختم ہوا۔ ناظرین کچھ دیر کے لیے ہال سے باہر نکلے اور مشروبات کے کاونٹر کے سامنے بھیڑ لگادی۔ چار سو سگریٹ کا دھواں یوں پھیل گیا جیسے کسی غریب بیوہ نے گیلے ایندھن سے چولہا گرم کیا ہو۔ ہاتھ میں وہسکی کا گلاس اٹھائے کیبرے ڈانسر بھی کاونٹر کے پاس چلی آئی اور بار مین سے سگریٹ مانگنے لگی۔ اس نے سگریٹ کو اپنے یاقوتی ہونٹوں میں دبا کر سلگایا ہی تھا کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اسے اپنی اہانت یاد آئی۔ اس لیے خفگی سے پکارنے لگی۔

"ہے، یو، کم ہیئر ...... تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟"

"ایک ادنیٰ سا آدمی۔ اور کچھ بھی نہیں۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے بے جھجک جواب دیا۔

"میرے ہیلو کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

"کوئی ضروری تو نہیں۔ میں ان رسمی طور طریقوں کا قائل نہیں۔ تم نے اپنی رسم نبھائی، میں نے جو مناسب سمجھا وہ ردِ عمل ظاہر کیا۔"

"واوٗ...... یو سیم ٹو ہیو گون نٹس! کہاں سے آئے ہو؟"

"آیا تو کشمیر سے ہوں البتہ ان دنوں اکادمی میں تربیت پا رہا ہوں۔"

"ہائے، یو آر فرام مائی کشمیر۔ میں بھی جہلم کی رہنے والی ہوں" کشمیر کا نام سن کر اس کے چہرے پر عجیب سی رونق چھا گئی۔ اس خوشی میں اس نے گلاس کی پوری وہسکی حلق سے نیچے اتار لی۔ اس کے

حریری حلق میں اترتی ہوئی شراب کی رَو باہر سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ حالانکہ مجھے اس کا پہلا نام ہوٹل کے اشتہار سے معلوم ہو چکا تھا تاہم جب اس نے جہلم کا ذکر کیا تو پورا نام جاننے کا اشتیاق ہوا۔

''آپ کا پورا نام جان سکتا ہوں!'' میں نے سوال کیا۔

''میرا نام شویتا مہروترہ ہے۔ کولابا ممبئی میں رہتی ہوں۔ میرے پتا جی کہا کرتے تھے کہ ان کا آبائی گھر بھی جہلم ندی کے کنارے پر واقع تھا۔ اب تو وہ علاقہ پاکستان کا حصہ بن چکا ہے۔'' اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اس کے دل کی کدورت کافور ہو چکی ہے۔ بہر حال اس کا چاؤ دیکھ کر میں اسے یہ نہیں کہہ پایا کہ جہلم دریا صرف کشمیر ہی میں نہیں بہتا ہے اور ہر آدمی جو جہلم کے کنارے رہتا ہے، کشمیری نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اسے خود کو کشمیری کہلانے میں فخر محسوس ہو رہا ہے، اس لیے میں نے اس کا بھرم قائم رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ دریں اثنا اس کی نگاہ دیوار گھڑی پر پڑی۔ اس نے جلدی سے گلاس میں بچی ہوئی وہسکی ایک ہی گھونٹ میں پی ڈالی اور سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ رقص کے دوسرے دور کے لیے تیار ہونے اپنے کمرے کی جانب دوڑ پڑی۔ جاتے جاتے وہ مڑی جیسے کوئی چیز بھول گئی ہو۔ پھر مجھ سے میرا نام پوچھا۔

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''پرفُل کول'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کسی دن شو شروع ہونے سے گھنٹہ بھر پہلے ہی چلے آنا۔ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

اب تو ہم گھرائیں ہیں اتنا کہہ کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

ٹھیک ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد میں شویتا سے ملنے اکیلے ہی چلا گیا۔ وہ باہر لاونج میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی پوچھنے لگی۔

''کیا منگواؤں۔ وہسکی یا بیئر؟''

''میں شراب نہیں پیتا۔ ہاں چائے چلے گی۔''

''چائے سے آدمی کی قوتِ باہ صلب ہو جاتی ہے۔ وہسکی پیا کرو، ہمیشہ گرم رہو گے۔'' اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس پر پھر کبھی غور کر لوں گا۔ فی الحال تو چائے ہی چلے گی۔''

شویتا نے میرے لیے چائے کا آرڈر دے دیا جبکہ اپنے لیے وہسکی منگوالی۔ اس کے بعد وہ پھر

گویا ہوئی۔

''کتنی چائے پیتے ہو؟''

''پندرہ بیس کپ روز کے۔''

''اوہ گاڈ! پھر تو تم گئے کام سے۔اب تو اوپر والا ہی بچا سکتا ہے تم کو۔''

میں نے اس کے انکشاف کو ہنسی میں ٹال دیا۔ چائے پی کر وہ مجھے اپنے ذاتی کمرے میں لے گئی جہاں چھوٹا سا پمیرین پلاّ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کو گود میں اٹھا کر وہ سیدھے اپنے بیڈ میں گھس گئی اور میں سامنے پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر اس کو نہارتا رہا۔ ہال میں رقص کرتی شویتا اور بیڈ میں لیٹی ہوئی شویتا میں زمین آسماں کا فرق نظر آ رہا تھا۔

دھیرے دھیرے اس نے اپنی زندگی کی کتاب کھولنی شروع کر دی۔ گفتگو کے دوران وہ فصیح انگریزی میں یوں کلام کرتی جیسے انگلستان میں ہی پلی بڑھی ہو۔

''مائی فادر واز فرام جہلم بٹ مائی مام واز اجپشن۔ وہ بیلی ڈانس میں ماہر تھی۔ جن دنوں پتا جی مصر میں انڈین کونسلیٹ میں ملازمت کرتے تھے ان ہی دنوں ان کی نظر ممی پر پڑی۔ انہیں ممی کا ڈانس بہت پسند آیا۔ بات شادی تک پہنچ گئی۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے پتا جی نے کولابا میں مکان خرید لیا تھا اور اس کے بعد وہیں پر سیٹل ہو گئے۔ ہم دو بہنیں ہیں...... نمرتا اور میں۔ نمرتا نے ممبئی ہی میں شادی کر لی اور نمرتا کھنہ بن گئی۔ میرے جیجا جی ممبئی میں فلم ایکٹر بننے کی غرض سے وارد ہو چکے تھے۔ فلم ایکٹر تو بنے نہیں البتہ فلموں میں ایکسٹراز اور ہجوم سپلائی کرنے کا کام کرتے ہیں۔ بہت ہی اچھے سبھاؤ کے آدمی ہیں۔ مجھے اتنا پیار کرتے ہیں کہ والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے۔'

تھوڑے وقفے کے لیے وہ رُک گئی اور اس دوران کتّے کے سفید نرم و ملائم بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی جیسے ان میں اپنا ماضی تلاش رہی ہو۔

ماضی تھا کہ بھنے جا رہے مکئی کے دانوں کی طرح دانہ دانہ پھوٹتا جا رہا تھا۔

''ڈو یو نو وہائی آئی واز فیسی نیٹڈ بائی یو؟'' اس نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

''نہیں...... مجھے کیا معلوم!''

''میرے بوائے فرینڈ کی شکل و صورت بالکل تمہاری طرح تھی۔ لمبا، گورا اور انا پرست۔ اپنے سے برتر کسی کو مانتا ہی نہیں تھا۔ جب میں سینٹ میری کونونٹ میں گیارہویں جماعت میں پڑھتی تھی، وہ ایئر

فورس میں فلائنگ آفسر بن کرممبئی چلا آیا۔ ہماری ملاقات ائیر فورس کے ایک میلے میں ہوئی۔ ہر سنیچر کو وہ اپنے یزدی موٹر سائیکل پر مجھ سے ملنے آتا اور مجھے میرین ڈرائیور گھمانے کے لیے لے جاتا۔ مجھے موٹر سائیکل رائیڈ بہت اچھی لگتی تھی۔ پھر چوپاٹی پر چاٹ اور پاؤ بھاجی کھانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ کبھی کبھار ہم دونوں جُوہُو بیچ کی گیلی ریت پر گھنٹوں ٹہلتے رہتے۔ کبھی سمندر کی موجوں سے کھیلتے اور کبھی ایک دوسرے پر پانی چھینکا کرتے۔ وہ بچپن کے دن اب تک نہیں بھول پائی۔

فلائنگ آفیسر سنجے کلکرنی نے جیسے قارون کا خزانہ پالیا تھا۔ میرے بغیر وہ ایک لمحہ بھی گزار نہیں پا رہا تھا۔ میں بھی کسی روک ٹوک اور احتیاط کے بغیر اسے ملتی رہی، اس کے ساتھ جگہ جگہ گھومتی رہی اور اس کی زندگی کی خالی جگہوں کو پُر کرتی رہی۔ ایک سال یوں ہی گزر گیا۔ اچانک میرے ذہن میں حمل ٹھہرنے کا اندیشہ پیدا ہوا۔ میں نمرتا کے پاس گئی۔ اس کے فیملی ڈاکٹر سے صلاح مشورہ کیا۔ میرا خدشہ صحیح نکلا۔ اس لیے بدنامی کے ڈر سے میں نے سنجے کو بلایا اور اس کے سامنے یہ راز افشا کیا۔ وہ پریشاں تو ہو گیا تاہم میری ڈھارس مسلسل بندھاتا رہا۔"

"تم فکر نہ کرو ہم دونوں کورٹ میں شادی رجسٹر کرلیں گے۔ کل جب سکول سے تمہاری چھٹی ہو جائے گی، میں تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے لے جاؤں گا۔" سنجے نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

رات کیسے گزری میں ہی جانتی ہوں۔ دوسرے روز سنجے آیا اور مجھے اپنے ساتھ کسی ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں اس نے مجھے آنے والی زندگی کی صعوبتوں سے روشناس کرایا اور مجھے ان کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"دیکھو شویتا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اس میں نہ تمہارا دوش ہے اور نہ میرا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پیار میں ایسے پاگل ہو چکے تھے کہ ہماری سوچ و فکر کی صلاحیت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ مگر اب بات دوسری ہے......"

"کیوں......اب ایسا کیا ہوا کہ بات دوسری ہو گئی؟"

"اب ہم تم پتی پتنی بننے والے ہیں۔"

"وہ تو ہم ہیں ہی۔ میں نے تو تمہیں اسی دن اپنا پتی مانا ہے جس دن میں پہلی بار تم سے ملی تھی۔"

"تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھ پائی۔ دیکھو، شادی کے بعد تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ جب میرے یونٹ کے افسروں کو تمہاری زچگی کی خبر ملے گی تو وہ ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔ طعنے دیں

گے اور شاید ہماری اولاد کو بھی عمر بھر یہی طعنے سننے پڑیں گے۔''

''اس میں طعنے والی کونسی بات ہے۔ جب ہم شادی کریں گے، اولاد تو ہماری ہی ہوئی ناں۔ کوئی ناجائز اولاد تو ہے نہیں۔''

''نہیں شویتا ایسا نہیں ہوتا۔ دنیا پیش از دواج اولاد کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس حمل کو گروا دو۔ میں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔''

مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی چھت مجھ پر آ گری ہو۔ سارے خواب ایک ساتھ ریت کی دیوار کی مانند ڈھنے لگے۔ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے جواب دیا۔

''سنجے، یہ میرے پیار کی پہلی نشانی ہے۔ میں نے اس نشانی کو پروان چڑھانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی، اپنی عزت سے کھیلا، سکول سے بھاگ کر تمہارے ساتھ چلی آئی اور اب تم مجھے اس نشانی کو تلف کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ سنجے، تم اتنے کائیر ہو سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''شویتا میں کائیر نہیں ہوں۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ عزت سے تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ تم مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔ آئے دن ابارشن ہوتے ہیں۔ آج کل اسقاط حمل میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ہم باضابطہ طور پر شادی کر لیں گے اور پھر جتنے چاہو اتنے بچے پیدا کر لیں گے۔''

''نہیں، میں ابارشن نہیں کراؤں گی چاہے تم مجھ سے سمبندھ رکھو یا نہ رکھو۔ سمجھے!''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''ہاں یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

وہ رات بھی اضطراب میں کٹ گئی۔ صبح ہوتے ہی ہم دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔ میں ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑی سوچنے لگی کہ اس بھری دنیا میں اب کہاں جاؤں۔ کہیں کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ غیر شعوری طور پر میرے قدم بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گئے اور میں گاڑی میں بیٹھ کر اپنی بہن کے پاس چلی گئی۔ نمرتا نے میری روداد سن کر کافی لعنت ملامت کی مگر جیجا جی نے دلاسہ دیا۔ انہوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے پوچھ لیا۔

''بیٹی۔ فیصلہ تو اب تم کو کرنا ہے۔ ہم تو صرف تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ تم سوچ سمجھ کر بتا دو کہ تم بچے کو جنم دینا چاہتی ہو یا نہیں۔ اس بات کو بھی مدِ نظر رکھنا کہ اب اس کا باپ اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔''

جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''ہاں جیجاجی۔ میں اس بچے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں پیار کی اس پہلی نشانی کو مٹانا نہیں چاہتی۔ بن بیاہے باپ کو کیا معلوم کہ پیٹ میں پل رہا بچہ ماں کے شریر کا انگ ہوتا ہے۔ اس کو فالتو سمجھ کر پھینک دینا ماں کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ میں اب جیؤں گی بھی اسی کے لیے اور مروں گی بھی اسی کے لیے۔''

اس کے بعد میں نے اسپتال میں ایک ننھی منی لڑکی کو جنم دیا۔ سال بھر اس کو پالا پوسا اور پھر اپنی بہن کے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔ چونکہ میں نے بچپن ہی میں اپنی ماں سے بیلی ڈانس سیکھا تھا اور ساتھ ہی باضابطہ ڈانس کلاسز بھی جوائن کر لیے تھے اس لیے ڈانس کو ہی اپنا کیریئر بنانے کا ارادہ کر لیا۔ کئی دروازے کھٹکھٹائے۔ فلموں میں ہاتھ پاؤں مارا لیکن ہر طرف سے ناکامی ہاتھ لگی۔ آخر کار کیبرے ڈانسر کا آفر ملا جو میں نے معاشی مجبوریوں کے سبب بنا سوچے سمجھے منظور کر لیا۔''

گفتگو طویل ہو رہی تھی۔ میں اس کی ایک ایک بات ذہن میں نوٹ کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں نمی کے سبب خود بخود چمک اٹھتیں۔ اسے شراب کی مزید طلب ہو رہی تھی۔ اس نے ٹیلی فون پر اپنے لیے وہسکی منگوائی، پھر میری جانب ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی اور گویا ہوئی۔

''آپ کے لیے تو وہی چائے۔ ہے نا!'' اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لوٹ آئی اور میرا اشارہ پاتے ہی اس نے روم سروس سے چائے بھی منگوائی۔

''یو مسٹ ہیو گون تھرو ہیل آل دیز ائیرس؟'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں استفسار کیا۔

''آف کورس! کرتی بھی کیا۔ آئی ہیڈ نو چوائس۔''

''اب بچی کہاں ہے؟''

اس متوقع سوال کو سن کر وہ میرے چہرے کو تھوڑی دیر کے لیے گھورتی رہی۔ پھر تکیے کے نیچے سے ایک پوسٹ کارڈ سائز فوٹو نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے فوٹو ہاتھ میں لے لیا اور اس خوبصورت بچی کی تصویر دیکھتا رہا۔

''کتنی سندر بچی ہے۔ گول مٹول، پیاری پیاری۔ اس کی عمر کیا ہوگی؟''

''گڑیا پچھلے مہینے دس سال کی ہو گئی۔ میں نے اس کو بورڈنگ سکول میں ڈالا ہے۔ ہر مہینے دو ہزار روپے پاکٹ منی بھیجتی ہوں۔ سکول کی فیس اور بورڈنگ کا خرچہ الگ۔ آئی وانٹ ہر ٹو فنش ہر سکولنگ فاسٹ۔ میرے پروفیشن کا کوئی بھروسہ نہیں۔ جب تک جوانی ہے، آمدنی ہے۔ جوانی ختم ہوئی

تو سمجھو دیٹ از دی اینڈ۔"

"اس کو تمہارے پروفیشن کے بارے میں جانکاری ہے؟"

"یس۔ اُس کو میں نے سب کچھ بتایا ہے۔ آئی ہیو رویلڈ مائی ہول لائف ٹو ہَر۔ وہ سمجھدار ہے۔ پڑھائی میں بھی تیز ہے۔ اچھے گریڈ لاتی ہے۔ آگے کی بھگوان جانے۔"

"تم شراب بہت پیتی ہو۔ اتنی دیر میں تم نے آدھی سے زیادہ بوتل پی لی ہوگی۔ اس پر اتنے سارے سگریٹ۔ آخر تم اپنی زندگی برباد کرنے پر کیوں تلی ہو؟"

"اور کیا کروں میری زندگی میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ بس گڑیا سیٹل ہو جائے، یہی آخری آرزو ہے۔ یہ شراب اور سگریٹ ہی تو میرے اکیلے پن کا علاج ہیں۔ ان کے بغیر میں کیسے جی سکتی ہوں۔"

دیوار پر لٹک رہی گھڑی نے رات کے آٹھ بجائے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ وقت کیسے گزر گیا۔ ہڑبڑی میں وہ بستر سے باہر لپکی اور تیار ہونے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔ جاتے ہوئے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"تمہیں اگر کیبرے دیکھنے کا موڈ ہو تو میں انتظام کرواؤں گی۔ ورنہ یہیں پر بیٹھے رہو۔ میں ہال میں جا کر جلد ہی لوٹ آؤں گی۔ پھر اکٹھے ڈنر کھائیں گے۔"

"ایک بار تو دیکھ لیا۔ اب کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ تم لوٹ آؤ۔ تب تک میں انتظار کرلوں گا۔"

بَن سنور کر وہ ہال میں چلی گئی اور میں کمرے میں بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا پمیرین اس کے بستر پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میری نظر میز پر رکھے فلمی میگزین پر پڑی۔ میں نے میگزین اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وقتاً فوقتاً میں پمیرین کو دیکھ لیتا اور پھر میگزین پڑھنے میں غرق ہو جاتا۔ اتنے میں شویتا لوٹ کر آئی۔ تھکی تھکی سی، بجھی بجھی سی۔ اس نے اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے پمیرین کو پچکارنے لگی۔ اس کے بعد اس نے اپنے سارے کپڑے حقارت سے یوں اتار پھینکے جیسے ان کا بوجھ سہہ نہیں پا رہی ہو۔ مجھے احساس ہوا کہ اس کی روح مجروح ہو چکی ہے۔ اس نے باتھ روم میں جا کر اپنا میک اپ درست کیا اور پھر وارڈ روب سے نئے بریزئیرس اور پینٹیز نکال کر ایک کے اوپر ایک پہن لیے۔ وہ حسن کی ملکہ لگ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مجھے اپنی طرف متوجہ پایا۔ وہ جلدی سے آ کر میری گود میں بیٹھ گئی اور بوسوں کی بارش کرنے لگی۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ باتھ روم میں جا کر از سر نو لپ اسٹک لگائی اور دوڑتی ہوئی رقص کے دوسرے دور کے لیے ہال میں چلی گئی۔

ڈانس ختم ہوا اور شویتا واپس کمرے میں چلی آئی جہاں میں بہت دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم کا بوجھ اتار کر نائٹ گاؤن پہن لیا اور ٹیلی فون پر ڈنر کا آرڈر دے دیا۔ اب وہ بہت ہی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔

اس روز کے بعد بھی میں کئی بار اسے ملا اور دیر رات تک باتیں کرتا رہا لیکن وقت کے جیسے پر لگ گئے۔ میرے کورس کی معیاد ختم ہوگئی اور مجھے اس سے رخصت ہونا پڑا۔ ہم دونوں یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ کون جانے روزگار کس کو کہاں لے جائے۔

بارہ سال بعد میری پوسٹنگ ممبئی ہوگئی۔ ایک روز محکمے کی کارکردگی کے متعلق میرا انٹرویو ممبئی کے مقامی اخباروں میں شائع ہوا۔ ساتھ ہی میری تصویر بھی چھپ چکی تھی۔ دوسرے دن میرے پرائیویٹ سیکرٹری نے ٹیلی فون پر بتایا کہ کوئی عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے سوچا یونہی شکایت درج کروانے کے لیے آئی ہوگی۔ اس لیے اندر بھیجنے کا حکم دیا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد میرے سامنے شویتا کھڑی تھی۔ سر کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھریاں نمودار ہو چکی تھیں۔ وہ پرانی بات کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی کہنے لگی۔

''آپ کو اعتراض نہ ہو تو سگریٹ پی لوں۔''

''ضرور۔ تم سگریٹ پی سکتی ہو۔ مجھے کوئی پرابلم نہیں۔'' میں نے دراز سے ایش ٹرے نکال کر اس کے سامنے رکھ دی اور ٹیلی فون پر پرائیویٹ سیکرٹری کو چائے کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔

''کیا حال ہے آپ کا؟ کبھی ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔'' اس نے دلبرانہ انداز میں پوچھ لیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم میری اچھی دوست ہو۔ تمہارا تو کوئی ٹھور ٹھکانا ہی نہیں رابطہ کیسے ہو پاتا۔ ایک بار میں نے ایوننگ نیوز دہلی میں پڑھا تھا کہ تم لیڈو ریستوراں میں ڈانس کرتی ہو۔ وہاں پہنچا تو ہوٹل والوں نے بتایا کہ تم ایک روز پہلے ہی کام چھوڑ کر ممبئی چلی گئی تھی۔ میں نے تمہارا ایڈریس دریافت کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔''

''ہاں مجھے اچانک ممبئی جانا پڑا تھا۔ مجھے خبر ملی تھی کہ گڑیا گوا کے کسی گانے والے کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور وہاں سے پرتگال چلی گئی ہے۔ ان دنوں وہ انسٹی ٹیوٹ آف ڈانس اور ڈرامہ میں زیر تربیت تھی۔''

''پرتگال......!''

''ہاں پرتگال۔آپ نے حال ہی میں وہ خبر تو ٹیلی ویژن پر دیکھ لی ہوگی جس میں پولیس نے عقیل بھائی کی بیوی مادھوی کو پرتگال سے واپس ہندوستان لایا۔گڑیا کا اصلی نام مادھوی ہے۔اس کو عقیل بھائی نے کسی پروگرام میں دیکھا تھا۔وہ نہ جانے اس گوا کے سنگر آسکر کے نرغے میں کیسے پھنس گئی۔عقیل بھائی نے آسکر کو مہرہ بنا کر زبردستی گڑیا سے شادی کر لی اور پرتگال چلا گیا۔ورنہ جرم کی دنیا کے ساتھ گڑیا کا کوئی سروکار ہی نہیں۔''

شویتا سگریٹ پر سگریٹ پیئے جا رہی تھی اور مسلسل کھانستی جا رہی تھی۔اس کی ویران آنکھوں میں اب کوئی خواب نظر نہیں آ رہا تھا۔وہ بالکل ٹوٹ چکی تھی۔

''پرفُل جی۔میں اب صرف موت کا انتظار کر رہی ہوں۔بہت جی لیا میں نے۔بس ایک بچی پر آس لگائے بیٹھی تھی سو اس نے بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔سوچا آپ کے ساتھ چند پل بیٹھ کر دل کا غبار نکال لوں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔مصافحے کے لیے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیے اور کہنے لگی۔

''اچھا پرفُل جی،اب اجازت دیجیے۔آپ کی چائے کی عادت اب تک نہیں گئی۔''

جاتے ہوئے اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا البتہ میری نگاہیں اس کے بوجھل قدموں کا تعاقب کرتی رہیں۔



میں ساری کی ساری تمہاری

میرے ایک دوست کی بہن لِلتا بی ایڈ کرنے کی غرض سے سرینگر آئی۔ چونکہ میں نے بھی اسی کالج سے دوسال پہلے بی ایڈ پاس کیا تھا اس لیے اس کی مدد کرنے کے لیے اکثر اس کے پاس جایا کرتا تھا۔

جون کے مہینے میں لِلتا کی ایک سہیلی اپنی ماں کے ہمراہ ہفتے بھر کے لیے وارد ہوئی۔ معلوم ہوا ماں دہلی میں نسائی امراض کی جانی مانی ڈاکٹر ہے جبکہ بیٹی ابھی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اتوار کو جب میں حسب معمول وہاں چلا گیا تو دونوں ماں بیٹی موجود تھیں۔ لِلتا نے میرا تعارف کرایا اور پھر چائے بنانے کے لیے رسوئی میں چلی گئی۔ اتنی دیر میں ہم آپس میں کشمیر کے اہم مقامات اور دستکاریوں پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔

''بیٹے، جب تم ہینڈی کرافٹس ایمپوریم میں کام کرتے ہو تو پھر تمہیں شالوں کی کافی پہچان ہوگی؟'' ڈاکٹر کملا دیوی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں تھوڑی بہت ہے مگر زیادہ نہیں۔'' میں نے بلا تامل جواب دیا۔

اس نے اپنی بیٹی سے کہا۔ ''سریتا بیٹی، وہ دوشال جو کل خریدے ذرا سریندر کو دکھا دو۔ کہیں مہنگے تو نہیں ہیں۔''

شال تو انہوں نے پہلے ہی خریدے تھے۔ سستے تھے یا مہنگے، اچھے تھے یا برے، اب اس بارے

میں رائے دینے سے کیا فائدہ ہوتا۔ دکاندار تو واپس لینے سے رہا۔ اس لیے میں نے ان کی دل آزاری کرنا مناسب نہ سمجھا۔

سریتا اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں پر شال لے کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ درمیانی قد، نمایاں چہرہ، بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں، ترشے ہوئے بال اور لبوں پر فتنہ زا مسکراہٹ۔ بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے دل میں شرارت سوجھی۔ شال لیتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ اس نے شوخ نظروں سے مجھے دیکھا اور مسکراتی ہوئی واپس ماں کے پیچھے بیٹھ گئی تا کہ اس کی حرکتوں کا علم اس کی ماں کو قطعی نہ ہو۔

میں نے ماہروں کی طرح شالوں کا معائینہ کیا، انہیں الٹا پلٹا اور پھر انگوٹھے اور انگلی کے درمیان رگڑ کر پرکھا۔ اس کے بعد اپنا فیصلہ سنایا۔ ''اچھے ہیں اور قیمت بھی واجبی ہے۔ آئندہ خریداری کرنی ہوتو مجھے ساتھ لے چلیں۔''

ہفتے بھر ماں اور بیٹی کشمیر کی سیاحت کرتے رہے۔ تین دن گلمرگ، پہلگام اور سونمرگ میں کاٹے۔ باقی دنوں میں نے ان کو مقامی مغل باغات، شنکر آچاریہ مندر، ڈل جھیل اور حضرت بل کی سیر کرائی، پہاڑی چڑھتے اترتے وقت سریتا جھٹ سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے کہتی۔ ''پلیز میری ہیلپ کرو۔'' اور میں خوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اوپر چڑھاتا یا پھر نیچے اُتارتا۔ ڈل جھیل کی سیر کرتے وقت وہ کشتی میں ٹھیک میرے پیچھے بیٹھ گئی اور وقتاً فوقتاً میری کمر پر پانی پھینکتی رہی۔ رفتہ رفتہ عشق پروان چڑھتا گیا اور وہ قریب سے قریب تر آتی گئی۔

دہلی لوٹنے سے پہلے ماں بیٹی نے ویشنو دیوی کے درشن کرنے کا فیصلہ کیا۔ کملا دیوی نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی جس کے لیے میں ترنت راضی ہوگیا۔ آخر ایسا موقع پھر کہاں ملتا۔ دس گھنٹے بس کا سفر تھا۔ چونکہ ہم بہت دیر سے روانہ ہوئے تھے اس لیے رات بٹوت دھرم شالہ میں گزارنی پڑی۔ وہاں سریتا میرے قریب بیڈ پر سوگئی اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ پوری رات وہ سو سکی نہ میں۔

دونوں گھپ اندھیرے کے باوجود ایک دوسرے کو من کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی آنٹی کی کھانسی یا کروٹ ہمیں چوکنا کر دیتی۔

دوسرے روز ماتا کے درشن ہوگئے۔ کٹڑہ سے گپھا تک کے سفر کے دوران سریتا میرے قریب چلتی رہی جبکہ آنٹی 'جے ماتا دی' کے نعر لگاتی ہوئی اگوانی کر رہی تھی۔ للِتا ہماری حرکتوں کی سدھ بدھ لے چکی

تھی۔ وہ کبھی کبھار مجھے شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''اب سمجھی یہ سارا طواف کس لیے تھا۔'' درشن کے بعد شام چھ بجے ہم جموں پہنچ گئے۔ رات نو بجے لِلتا اور میں نے دونوں ماں بیٹی کو جموں ریلوے سٹیشن سے رخصت کرلیا۔ پھر دیر رات تک لِلتا اور میں اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔

مجھے اپنے بھائی کی طرح چاہنے لگی تھی۔ اس لیے بڑے خلوص کے ساتھ بولی۔

''بھیاّ، تمھیں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ یہ بڑے نازوں میں پلی ہے۔ اس کے گھر میں ہُن برستا ہے۔ جبکہ تمہارے گھر کے حالات اس کے برعکس ہیں۔ تمہارے پتاجی کی آمدنی بالکل تھوڑی سی ہے۔ اس کی بیوی بھی نہیں ہے۔ چار بچوں کو پالتا ہے۔ پھر تین لڑکیوں کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ بھیاّ ذرا سوچو تو، کیا ڈاکٹر سریتا تمہارے گھر میں ایڈجسٹ ہو پائے گی؟''

''مجھے نہیں معلوم یہ سب کیسے ہوا۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں نے تمہاری بات گرہ میں باندھ لی ہے۔ اس پر ضرور غور کروں گا۔''

''سریتا کے اصلی پتاجی کا کوئمبٹور میں سوتی کپڑے بنانے کا کارخانہ ہے۔ تین اور بچے ہیں۔ یہ عورت جو اس کے ہمراہ تھی اصل میں اس کی پھوپھی ہے۔ اس نے بچپن ہی میں اسے گود لیا تھا۔ کملا دیوی، اس کا چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہن تینوں سن سینتالیس میں لاہور سے بھاگ کر آئے تھے۔ کسی نے شادی نہیں کی۔ اسی لڑکی کو گڑیا کی طرح پال رہے ہیں۔ خود ہی سوچو کتنی امیدیں باندھی ہوں گی انہوں نے سریتا کے ساتھ......!''

لِلتا کی باتوں میں دم تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ خواہ مخواہ مجھے کسی کی زندگی برباد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں دھیرے دھیرے اس معاملے سے کنارہ کشی اختیار کرلوں گا۔ کچھ عرصے کے بعد دہلی سے میرے دوست اور رفیق کار سلیم احمد کا، جو ایمپوریم کے دہلی برانچ میں کام کررہا تھا، ٹیلی فون آیا۔ ''سریندر، تم تو چھپے رستم نکلے، لڑکی پھنسائی اور ہمیں بتایا بھی نہیں۔''

''یار ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یونہی جان پہچان ہوگئی۔ کوئی سیریس معاملہ نہیں ہے۔ خیر تمہیں کیسے معلوم؟''

''بھئی، اس کا ہوسٹل یہاں سے چند فرلانگ کی دوری پر ہے۔ وہ اکثر شام کو ٹہلتی ہوئی یہاں سے گزر جاتی ہے۔ کبھی کبھار ایمپوریم میں بھی آجاتی ہے۔ تمہارے بارے میں پوچھتی رہتی ہے۔ وہ تمہاری دیوانی ہوچکی ہے۔''

''کیابات کرر ہے ہو سلیم۔ میں تو یونہی فلرٹ کرر ہا تھا۔ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''دلچسپی نہیں ہے۔ سرینگر سے ویشنو دیوی اس کے ساتھ گئے اور کہتے ہو دلچسپی نہیں ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ رات دن تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ بار بار تمہارا ذکر کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ یہ پاگل پن چھوڑ دو اور اسے ٹیلی فون پر بات کرلو۔ ورنہ وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے گی۔''

اس کے بعد سلیم احمد نے کئی بار ٹیلی فون پر ہم دونوں کی بات کروائی۔ اور اس طرح معاملہ سنجیدہ سے سنجیدہ تر ہوتا گیا۔

بہر کیف مجھے للِتا کی وہ بات رہ رہ کر یاد آ رہی تھی کہ میں اس کے لائق نہیں ہوں۔ اس لیے میں نے گھریلو حالات کو پس پشت ڈال کر اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور کوئی اچھی سی نوکری ڈھونڈنے کے لیے دہلی چلا گیا۔ دہلی پہنچتے ہی ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں پوسٹ گریجویٹ ٹیچر کی اسامیوں کے لیے نام رجسٹر کروایا۔ چھ مہینے انتظار کرتا رہا پر کہیں سے کوئی بلاوا نہیں آیا۔ ایک ہندی میڈیم سکول میں نوکری ملی مگر ہندی پر مجھے دسترس نہیں تھی اس لیے پندرہ روز کے اندر ہی وہ نوکری بھی چھوڑ دی۔ جتنا کچھ روپیہ پیسہ جیب میں تھا سب خرچ ہو گیا۔ نتیجتاً واپس سرینگر جانا پڑا۔ خوش نصیبی یہ رہی کہ جس محکمے سے میں نے استعفیٰ دیا تھا وہاں کے مینجنگ ڈائریکٹر نے مجھے استعفیٰ واپس لینے کی اجازت دے دی اور میں پھر سے وہیں پر بحثیت اسسٹنٹ منیجر کے بحال ہو گیا۔ چار پانچ مہینے کے بعد ترقی پا کر پلاننگ افسر بن گیا اور اس کے بعد مہینے کی آمدنی چار سو پچاس ہو گئی۔

بہر حال یہ حقیقت تو میرے سامنے تھی کہ کاتب تقدیر نے یہی کچھ میرے لیے لکھا تھا۔ میں دہلی میں جتنی بھی دیر رہا اپنے دوست کے پاس ہی رہا۔ ڈاکٹر سریتا کئی بار ہوسٹل سے بہانا بنا کر میرے پاس چلی آتی اور رات بھر میرے ساتھ لپٹ کر سو جاتی۔ کبھی کبھار جب میں اپنے آپ پر قابو پانے میں ناکام رہتا تو وہ مجھ کو سنبھالتی اور فلم کا وہ گانا گاتی۔ ''میں ساری کی ساری تمہاری، پھر کاہے کو جلدی کرو تم۔'' میں جلدی ہی سنبھل جاتا۔ آج جب میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو سب کچھ ایک حسین خواب سا لگتا ہے۔ خود پر ہنسی بھی آتی ہے اور فخر بھی محسوس ہوتا ہے کہ اتنی قربت کے باوجود میں نے اپنی محبوبہ کا احترام کیا اور سرحدیں پار کرنے سے اپنے آپ کو روکا۔ یہ بات اپنی جگہ کہ قیامت بغل میں ہوتی اور خود کو روکنے کے لیے مجھے کس طرح آگ کا دریا پار کرنا پڑتا۔ بہر حال اس کی دوشیزگی اور پاکدامنی کے خیال سے زیادہ مستقبل کے حسین خوابوں نے مجھے آگے بڑھنے سے روک لیا۔

اب تو حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ مجھے یقین ہوا کہ سریتا سے شادی کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا ہے۔ کئی سوالات دل و دماغ میں اٹھتے رہے۔ جس آنٹی نے مجھے بیٹے کا رتبہ دیا، جس کی صورت میں مجھے اپنی کھوئی ہوئی ماں نظر آئی، اس آنٹی کو میں دھوکہ کیسے دے سکتا ہوں۔ اگر میں اسے سریتا کا ہاتھ مانگوں تو اس پر آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ وہ سمجھے گی کہ میں نے اس کی پیٹھ پر چھرا بھونک دیا ہے۔ نہ جانے اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے کیسے کیسے خواب سجائے ہوں گے؟ ان سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ اپنی طرف سے میں نے پوری کوشش کی تھی کہ دہلی جا کر اپنی زندگی سنواروں اور ان خوابوں میں رنگ بھردوں مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔

میں نے اپنی مجبوریوں کا جائزہ لے کر سریتا کو خط لکھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ میں ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہوں، چار سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پاتا ہوں جبکہ تم لاکھوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث ہو۔ ہمارے درمیان دولت کی جو فصیل ہے اس کو میں گرا نہیں سکتا۔ اس کے باوجود میں نے دہلی میں چھ مہینے رہ کر بڑی کوشش کی کہ کوئی اچھی سی نوکری مل جائے اور میں تمہارے قابل بن جاؤں مگر میں اس کوشش میں ناکام رہا۔ اس لیے اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم اس رشتے کو یہیں پر منقطع کریں۔ تمہارے جتنے بھی خطوط اور فوٹو میرے پاس ہیں وہ سب میں لوٹا رہا ہوں تاکہ تمہیں میری طرف سے کوئی اندیشہ نہ رہے۔

خط پڑھتے ہی سریتا بے ہوش ہوگئی۔ آنٹی اور گھر کے دوسرے افراد پریشان ہوگئے۔ انہوں نے سریتا کو اسپتال میں بھرتی کروادیا اور اُسے احتیاطاً پانچ چھ روز وہاں پر زیر ملاحظہ رکھا۔ اسپتال کا ایک زیر تربیت ڈاکٹر دن میں کئی بار سریتا کا معائینہ کرنے کے لیے آتا اور اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتا۔ موقع غنیمت جان کر آنٹی نے اس کے گھر والوں سے بات چلائی اور چھ ہی مہینوں کے اندر دونوں کی شادی ہوگئی۔ ان کی شادی کے بعد ہی میں نے بھی انڈین سول سروسز کا امتحان پاس کیا۔ اب میں اس کے لائق بن چکا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ کسی اور کی ہوچکی تھی۔ ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے کہ جب زیور ہوتے ہیں تو کان نہیں ہوتے اور جب کان ہوتے ہیں تو زیور نہیں ہوتے۔ خیر اس کے بعد ہی میری بھی شادی ہوگئی۔

بہت عرصہ تک میں ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں ٹرانسفر ہوتا رہا۔ کبھی سول میں اور کبھی فوج میں۔ پھر اٹھارہ سال کے بعد دہلی پوسٹنگ ہوئی۔ دہلی میں قدم رکھتے ہی میں نے سریتا

سے رابطہ قائم کیا۔ اس نے مجھے دوسرے دن اپنے کلینک پر بلایا۔

اس روز وہ شدت سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ کلینک میں دو ایک مریض تھے جن کو ڈاکٹر سریتا نے جلدی جلدی نپٹا لیا۔ پاس ہی چائے کی دکان سے توس آملیٹ اور چائے منگوائی۔ ایک دس بارہ سال کا لڑکا کاغذ کے کپ پلیٹوں میں دو چائے اور آملیٹ لے کر آ گیا۔ سریتا نے اسی پرانے انداز میں بڑے پیار سے توس میں بھرا آملیٹ پہلے مجھے کھلایا اور پھر اسی میں سے خود بھی کھا لیا۔ میں نے بھی پرانی شرارت دہرائی اور نہ صرف توس آملیٹ کاٹا بلکہ ہلکے سے اس کی انگلی بھی کاٹ لی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ دھیرے دھیرے وہ میرے بہت قریب آ گئی مگر اس سے پہلے کہ میرے گلے لگ جاتی اس نے کلینک کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور کھڑکی پر پردے ڈال دیے۔ اس کے بعد سریتا نے مجھے بے تحاشہ گلے لگا یا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ آج بالکل آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھی ہے۔ میں نے پہلے کبھی اس کی ایسی حالت نہیں دیکھی تھی۔ تب بھی نہیں جب وہ میرے ساتھ راتیں گزارتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پر آج کیسا جنون طاری ہوا ہے۔

آخر کار وہی ہوا جس کی ڈاکٹر سریتا نے ٹھانی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر میرے حوالے کر دیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ برسوں کی تشنگی مٹا رہی ہے۔ آج پہلی بار اس کے چہرے پر فتح اور تشفی کے ملے جلے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے بعد سریتا نے دوبارہ چائے منگوائی اور پھر دیر تک ہم دونوں اپنی اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

میں نے اپنی ناکام شادی کی روداد یہ سوچ کر سریتا کو سنائی کہ شاید اس کو میرے ساتھ ہمدردی ہوگی اور وہ کم سے کم مجھے تسلی دے گی۔ مگر اس کے برعکس سریتا نے مجھے یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا۔ ''بہت اچھا ہوا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ اسی کا انجام بھگت رہے ہو۔ معلوم ہے جس دن مجھے تمہارا خط ملا تھا میں کتنا روئی تھی۔ اس دن میں نے تمہیں جی بھر کر کوسا تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ آہ کے اثر ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔''

میں اس کے فتح مند چہرے کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ من میں سوچنے لگا کہ کیا اس نے سچ مچ دل کی گہرائیوں سے مجھے کوسا ہوگا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے رخصت ہوا راستے میں یہی سوچتا رہا کہ یہ لڑکی عجیب سی ہے، پیار بھی کرتی ہے تو جم کر اور نفرت بھی کرتی ہے تو جم کر۔



REEZA REEZA HAYAT

Deepak Budki



ہماری تازہ ترین مطبوعات

کتاب	مصنف	کتاب	مصنف
غالب جہاں دیگر	پروفیسر حامدی کاشمیری	ناول کا فن، ارتقاء اور لندن کی ایک رات	ڈاکٹر زور کشمیری
اردو نظم کی دریافت اول دوم	پروفیسر حامدی کاشمیری	قہر نیلے آسمان کا	سیدہ نگہت فاروق
کشمیر قلم	محمد یوسف ٹینگ	عمر مجید کے بہترین افسانے	سلیم سالک
جدید فارسی شاعری کا عصری شعور	ڈاکٹر محمد شفیع خان	تعمیر سیرت	عبدالمجید خان نوشہری
بھدرواہ کے معتبر اردو شعراء	پروفیسر شہاب عنایت ملک	شہ زور کاشمیری حیات اور شاعری	ڈاکٹر فرید پربتی
جموں وکشمیر میں اردو افسانہ (پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک)	سلیم سالک	درس اخلاقیات	ابن حبیب
ارمغان شہاب	پروفیسر شہاب عنایت ملک	پرچھائیوں کا شہر	پروفیسر حامدی کاشمیری
مضامین شہاب	پروفیسر شہاب عنایت ملک	پروفیسر مرغوب بانہالی کی اردو ادبی خدمات	شبیر احمد بٹ
تجزیاتی مطالعے (حامدی کاشمیری کے منتخب مضامین)	جاوید احمد ماٹجی	اردو میں علاقائی ناول	ڈاکٹر شگفتہ تبسم
ریزہ ریزہ حیات	دیپک بدکی	سونہ سوراچھر	سید اختر حسین
اردو ناول تنقید و تحقیق	ڈاکٹر طارق تمکین	ناول پریم چند اور میدانِ عمل	ڈاکٹر زور کشمیری
عصری تحریریں (تبصرے و تنقیدی مضامین جلد اول)	دیپک بدکی	کتاب دریچہ	محمد سلیم سالک
عصری شعوری (تبصرے و تنقیدی مضامین جلد دوم)	دیپک بدکی	نکات اُردو	ڈاکٹر زور کشمیری
وتستا کی سیر	ڈاکٹر عزیز حاجنی	جموں وکشمیر میں اردو زبان (ماضی، حال، مستقبل)	پروفیسر شہاب عنایت ملک
تعلقات اقبال	ڈاکٹر مشعل سلطانپوری	بند کمرے کی کھڑکی	نور شاہ
ارمغان وادی	ڈاکٹر میر حسام الدین	کہاں گئے یہ لوگ	نور شاہ
پروفیسر مرغوب بانہالی (بحیثیت اقبال شناس)	پیر نصیر احمد	عصمت چغتائی	ڈاکٹر دل افروز قاضی
شبستانِ وجود (ایک صحافی کی سرگزشت)	مقبول ساحل	جامعہ کشمیر اور اقبالیات	ڈاکٹر بدرالدین بٹ
موج بس موج	جاوید ماٹجی	نغز شعر	مترجم ڈاکٹر محمد جعفر احراری
اقبال اور اقبالیات	پروفیسر عبدالحق	اقبالیات ۱۹	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
دیپک بدکی کی افسانہ نگاری	جاوید اقبال شاہ	تصوف کے خدوخال	جسٹس علی محمد میر
صحبت صالحین (فکر اقبال کی روشنی میں)	فیض احمد فیاض	آسمان پھول اور لہو	نور شاہ
سوغات حجاز	مولوی اسداللہ دار	ارمغان تائب	پروفیسر سیف الدین سوز
گردش دوراں	حسن ساہو	غافل (افسانوں کا مجموعہ)	مشتاق احمد کینی
نورشاہ کے تین ناولٹ	رؤف راحت	تاریخ مشائخ کشمیر (3 جلد)	انجینئر محمد اشرف فاضلی
نالہ نیم شب	ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی		
گراو، نہ جواب گراوٗ	مترجم جاوید ماٹجی		
زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی	دیپک بدکی		

Title	Author
Special Education	Bilal Ahmad Khan
Ladakhi Society	Dr. Ali Mohammad
Social Transformation in central As ia	Dr. Ali Mohd. Rather
Complaint & Answer	Javid Matjee (Compiler)
Understanding the Kashmiri Mind	S.T. Hussain
Child Labour in J&K	Dr. F.A. Nika
The Islamic Movement in Kashmir	Ashiq Kashmiri



978-93-80691-29-9

9 789380 691299

Meezan Publishers

Opp.Fire & Emergency Services HQ, Batamaloo, Srinagar Kashmir-1900 09

Telephone: 0194-2470851, 9419002212 Fax : 0194-2457215

email: meezanpublishers@rediffmail.com